

WWW.PAKSOCIETY.COM

# ایک مُحبت اور سہی

ہاشم ندیم



WWW.PAKSOCIETY.COM

# ایک محبت اور سہمی

”وہ نظام بدلنا چاہتے تھے، لیکن انہیں ہر قدم پر سماج کے اک نئے ”ان داتا“ کا سامنا تھا“

ہاشم ندیم

علم و عرفان پبلشرز  
الحمد مارکیٹ، 40۔ اردو بازار، لاہور  
فون 7352332-7232336

**نوٹ:**

اس کتاب کے جملہ حقوق بحق مصنف (ہاشم ندیم) اور پبلشرز (علم و عرفان) محفوظ ہیں۔ ادارہ علم و عرفان نے اردو زبان اور ادب کی ترویج کیلئے اس کتاب کو [kitaabghar.com](http://kitaabghar.com) پر شائع کرنے کی خصوصی اجازت دی ہے، جس کے لئے ہم انکے بے حد ممنون ہیں۔

## جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ

ایک محبت اور سہمی	.....	نام کتاب
ہاشم ندیم	.....	مصنف
گل فراز احمد	.....	ناشر
علم و عرفان پبلشرز، لاہور	.....	مطبع
زاہدہ نوید پرنٹرز، لاہور	.....	پروف ریڈنگ
منصور بیٹ، شیر محمد طاہر	.....	کمپوزنگ
حاجی، انیس احمد	.....	سن اشاعت
دسمبر 2010ء	.....	قیمت
500/- روپے	.....	

..... ملنے کے پتے .....

علم و عرفان پبلشرز

الحمد مارکیٹ، 40۔ اردو بازار، لاہور

فون 7352332-7232336

ادارہ علم و عرفان پبلشرز کا مقصد ایسی کتب کی اشاعت کرنا ہے جو تحقیق کے لحاظ سے اعلیٰ معیار کی ہوں۔ اس ادارے کے تحت جو کتب شائع ہوں گی اس کا مقصد کسی کی دل آزاری یا کسی کو نقصان پہنچانا نہیں بلکہ اشاعتی دنیا میں ایک نئی جدت پیدا کرنا ہے۔ جب کوئی مصنف کتاب لکھتا ہے تو اس میں اس کی اپنی تحقیق اور اپنے خیالات شامل ہوتے ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ آپ اور ہمارا ادارہ مصنف کے خیالات اور تحقیق سے متفق ہوں۔ اللہ کے فضل و کرم، انسانی طاقت اور بساط کے مطابق کمپوزنگ، طباعت، تصحیح اور جلد سازی میں پوری احتیاط کی گئی ہے۔ بشری تقاضے سے اگر کوئی غلطی یا صفحات درست نہ ہوں تو اذرا و کرم مطلع فرمادیں۔ انشاء اللہ اگلے ایڈیشن میں ازالہ کیا جائیگا۔ (ناشر)



## باب 1

کبھی کبھی شام اس طرح ڈھلتی ہے جیسے وہ افق کے پار نہیں بلکہ قطرہ قطرہ کر کے ہمارے اندر اتر رہی ہو۔ سر کی جھالروں سے ڈھکے گلابی بادل سورج ڈھلنے کے بہت دیر بعد بھی فلک پر دکتے رہتے ہیں۔ وہ بھی ایک ایسی ہی شام تھی۔ دلوں میں بھیگا سر کی اجالا کھیرنے والی شام..... فضا کو گلابی کر دینے والی شام.....

بارش کی بوندوں سے تازہ بھیگی ہوئی سڑک پر ”کیف فراق“ کے ادھ چلے یا ادھ بجے نیون سائمن کی زرد دیتیوں کا عکس وقفے وقفے سے ابھر رہا تھا۔ کبھی کبھی ”اصل“ سے ”عکس“ زیادہ خوبصورت ہوتا ہے۔ یا شاید انسان ہمیشہ سے طے شدہ اجسام کی ترکیب و ترتیب بدلنے کا خواہش مند رہا ہے۔ تبھی وہ حقیقت سے زیادہ سراپ کو نہارتا ہے۔ ”کیف فراق“ جو کبھی ”کیف فراق“ تھا، آج بھی ہمارے محلے کی بیرونی سڑک کے چوراہے کے بائیں کونے پر اس لئے پڑے عاشق کی طرح خاموش ایستادہ تھا جسے مدتوں پہلے سے اس حقیقت کا ادراک ہو چکا ہے کہ اب اس کا محبوب کبھی واپس نہیں لوٹے گا..... لیکن انتظار تو عاشق کی سرشت ہے، سو محبوب کی واپسی بھلا کب شرط عاشقی ٹھہری.....؟

میں نے جب سے ہوش سنبھالا تب سے کیف فراق اور اس کے اکلوتے ”پرو پرائزر“ چچا فراق کو بعینہ اسی حالت میں پایا تھا، مدد و سال کی گردش و دونوں کی خوشگلی میں کچھ زیادہ بدلاؤ نہیں لاسکی تھی۔ کہتے ہیں جب چچا فراق نے اپنے آخری عشق میں ناکامی کے بعد شاعری اور عشق دونوں کو خیر آباد کہہ کر یہ ریٹائرمنٹ کھولنے کی ٹھانی، تب اس کا نام انہوں نے اپنی طبعی حالت غیر اور اپنے تخلص، دونوں کو یکجا کر کے ”کیف فراق“ رکھا تھا لیکن یہ ”لطف جدائی“ زیادہ عرصہ ریٹائرمنٹ کے بورڈ کا ساتھ نہ دے سکا اور رفتہ رفتہ لوگ اسے ”کیف فراق“ کے نام سے پکارنے لگے۔ ایک زمانے میں یہاں کی ہاف سیٹ چائے کا شہرہ دور دور تک تھا اور سر شام ہی کیف کے باہر فٹ پاتھ پر پڑی میزیں دفتری بابوؤں اور نچلے درمیانے طبقے کے سرکاری ملازمین سے بھر جاتی تھیں۔ ہماری کالونی جو خود بھی ایسے ہی نچلے درجے کے سرکاری ملازمین کی رہائش گاہ تھی اور بابو کالونی کے نام سے جانی جاتی تھی۔ دراصل اسی کیف فراق کی شہرت کی مرہون منت تھی، کیف سے ذرا آگے چند قدم دور سڑک کے پار جو پرانا بس اسٹاپ تھا وہ بھی بابو کالونی سٹاپ یا فراق سٹاپ کہلاتا تھا۔

مجھے یاد ہے کہ بچپن میں ہم سب دوست اسکول جاتے وقت صبح سویرے یا پھر شام کی چائے سے پہلے اپنی جیبوں میں سکے چھکاتے فراق چچا کے ہوٹل آدھکتے اور شیشے کے لمبے لمبے مرتبانوں میں شہر کی مشہور بسبھی بیکر کے بنے ہوئے کیک رس، بن شیر مال یا پھر ایرانی ”ٹھیک“، بل کی زرد اور سبز پیون کو پھرو لے تو چچا سے خوب ڈانٹ پڑتی۔ کاؤنٹر کے ساتھ ہی پولکا آکس کریم سے بھرا بڑا سا دائرہ نما تھرماس بھی رکھا رہتا تھا۔ جس دن ہمارے پاس سب دوستوں کے لئے علیحدہ علیحدہ پولکا آکس کریم کی کون یا کپ خریدنے جتنے پیسے جمع ہو جاتے اس روز تو گویا ہماری عید ہو جاتی تھی، اور جب کبھی لکا سوڈا، سیون اپ یا ایل سوڈا کی ٹھنڈی بوتلیں ہماری دسترس میں آتیں تو ہم ان کے ڈھکن میں چھپے نرم ربڑ کے گول اسکر نکال کر اپنی

جیہوں میں بھر لیتے۔ اس ڈھکن میں پیوست گول ربڑ کے اوپر ہمارے پسندیدہ کارٹونز مثلاً پوپائے، ڈولڈ ڈک، اور دیگر کی تصاویر چھپی ہوتی تھیں۔ پھر سارا سال ان ربڑ کی گول مہروں کی میٹھی مہک سے ہمارے اسکول کی کتابوں اور کاپیوں میں خوشبو پھی رہی تھی۔ جانے ہماری زندگی سے ہمارے بچپن کے رنگ اور خوشبو وقت کے ساتھ ساتھ کیوں اڑ جاتے ہیں؟ جیون اتنا پھیکا کیوں پڑ جاتا ہے؟

ہمارے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔ اسکول سے کالج اور کالج سے یونیورسٹی تک زندگی کی قوس وقروح سے کئی رنگ اڑ گئے۔ ہمارے والدین بوڑھے اور ان کی فکر اور پریشانیوں فزوں تر ہوتی چلی گئیں۔ شاید غربت بذات خود ایک ایسی آکاس نیل کی جڑ ہے جسے دکھوں، غموں اور پریشانیوں کی ڈالیاں پھیلانے کے لیے مزید کسی آبیاری کی ضرورت نہیں پڑتی۔ غم کے کالے سائے سدا کے لیے اس کا مقدر اور فکر کی گتھی پر چھائیاں ہمیشہ سے غربت کا نصیب ہوتی ہیں۔ کبھی کبھی میں سوچتا تھا کہ اگر خدا ہم سبھی کو ایک جیسی تقدیر سے نواز دیتا تو اس کے خزانے میں کون سی کمی آ جاتی.....؟

لیکن یہ تب کی بات ہے کہ جب ہم آوارہ گردوں کو غربت نام کی دیمک چھو نہیں پاتی تھی۔ ہم سب اپنی ایک الگ دنیا میں مست تھے۔ جہاں فکر اور غم نام کا کوئی بھی گھنا سا یہ ہمارے بلند قدموں کی دھوپ کے سامنے ٹک نہیں پاتا تھا۔ ایک ایسی دنیا جہاں صبح زیادہ روشن اور دن کہیں زیادہ کھلے رہتے۔ جہاں شا میں گلابی اور رات میں سرمئی خوابوں کی آماجگاہ بنی رہتی تھیں۔ میں آیان احمد ایک ایسی ہی دنیا کا باسی تھا۔ ریٹائرڈ ہیڈ ماسٹر تو قیر کا نالائق بیٹا..... رشتے سے پہلے کا سابقہ میرے ابا کے الفاظ میں میرے تعارف کا سدا بہار صیغہ تھا۔ ان کے بقول میرے ”آوارہ“ اور ”لوفر“ دوستوں کی صحبت نے مجھے کہیں کا نہیں چھوڑا تھا، حیرت کی بات یہ تھی کہ ہم چاروں کے والدین ایک جیسی رائے رکھتے تھے لہذا ہم سبھی دوستوں کے لیے یہ بات ہمیشہ سے ہی ایک معرہ بنی رہی کہ آخر ہم میں سے اصل آوارہ اور لوفر ہے کون.....؟؟؟

آیان احمد یعنی میں، اقبال (بالا)، راجہ اور جہانگیر عرف مٹی..... ہم سب ناٹ کے پرائمری اسکول سے یونیورسٹی تک نہ صرف ہم پیالہ ہم نوالہ بلکہ ”ہم محلہ“ بھی رہے تھے۔ ہماری دوستی ”غرض“ نام کی کسی بھی بیماری سے مبرا تھی اور ہم سبھی کو ایک دوسرے کے ماں باپ کی اپنے بارے میں تمام ”زریں“ آراء کا بچپن سے ہی بخوبی علم تھا لیکن ہم نے کبھی اپنے بارے میں ایسی کسی رائے کو بد لنے کی کوشش بھی نہیں کی تھی۔ ہم جو تھے، بس تھے اور زمانے سے ہمیں بس یہی درکار تھا کہ ”جہاں ہے جیسا ہے“ کی بنیاد پر ہمیں قبول کیا جائے۔

میرے ابا سرکاری اسکول کی ہیڈ ماسٹری سے ریٹائر ہونے کے بعد بس ایک ہی ارمان دل میں بسائے جی رہے تھے کہ ان کے دونوں بیٹے کمیشن پاس کر کے بڑے ماسٹر (اسٹنٹ پروفیسر) بھرتی ہو جائیں تاکہ ان کی زندگی کی سب سے دیرینہ خواہش پوری ہو سکے۔ مجھ سے بڑا ریحان احمد تو پھر بھی کسی نہ کسی طور محنت کر کے ۱۶ جماعت پاس کر چکا تھا اور اب ابا کے حکم اور خواہش کی تعمیل میں دن بھر پبلک سروس کمیشن کے دفتر کے چکر کاٹتا رہتا تھا لیکن سچ پوچھیں تو یہ پروفیسری میرے بس کا روگ نہ تھی۔ مجھے تو اپنی کلاس کے پروفیسروں کو دیکھتے ہی غلجبان سا شروع ہو جاتا تھا اور پھر میرے ابا پر ہی کیا منحصر؟ اس کا لونی میں ہم سبھی نوجوانوں کے والدین اپنی اولاد سے اپنی ہی کسی حسرت نام تمام کی تکمیل چاہتے تھے۔ بالے کے ابا کسی سرکاری ورکشاپ میں مکینک تھے اور ان کی خواہش تھی کہ بالا اسی ورکشاپ میں ہیڈ مسٹری لگ جائے۔ راجہ کے ابا کرک تھے اور وہ دن رات اسی فکر میں دبے ہوئے جاتے تھے کہ ان کا بیٹا بی اے کرنے کے بعد انہی کے محکمے میں کم از کم سپرنٹنڈنٹ بھرتی ہوگا۔

جہانگیر (مٹی) اور جاوید (مٹھو) کے ابا محکمہ صحت میں ڈپنسر تھے اور دونوں میں ہی سارا سال اسی بات پر ٹھنی رہتی تھی کہ پہلے کس کا

سپت ہسپتال میں انچارج ڈپنسر کی کرسی سنبھالے گا۔ جانے یہ والدین اپنی زندگیوں کی تمام ناکامیوں کے داغ اپنے بچوں کی خواہشات کے خون سے ہی کیوں دھونا چاہتے ہیں؟ حالانکہ ہم سبھی کے والدین کی خواہشات معصوم اور ہماری دسترس سے زیادہ دور بھی نہیں لیکن ہماری بد نصیبی یہ تھی کہ ہمارا خیر بابو کا لونی کی مٹی سے کوسوں پرے گوندھا گیا تھا۔ اگر کوئی تصور دار تھا تو وہ ہمارا نصیب تھا، اگر کچھ قابلِ تعذیر تھی تو وہ قسمت تھی جس نے ہمیں ان معصوم خوابوں کی بھٹی میں جھونک تو ڈالا مگر خود ہمارے اندر خواب گر بننے کی صفت پیدا کرنا بھول گئی۔

گھر میں میرے علاوہ مجھ سے بڑا ریحان اور مجھ سے چھوٹی رافہ تھی جس کی صبح ہم دونوں بڑے بھائیوں کے نام کے ورد سے شروع ہوتی اور رات مجھے ابا کے غصے و غضب سے بچانے میں صرف ہو جاتی تھی۔ امی بالکل ویسی ہی دھان پان سی، آنکھوں پر نظر کا چشمہ لگانے والی ہزاروں، لاکھوں امیوں جیسی تھیں جنہیں آخر وقت تک یقین ہوتا ہے کہ ان کا ہونا ہر سوت دنیا کی تمام تر توقعات کے باوجود ایک دن سکندر اعظم کی طرح فاتح بن کر لوٹے گا۔ ویسے اس معاملے میں ریحان کافی ہوشیار واقع ہوا تھا اور وہ اپنی روایتی مسکنی اور عاجزی کے بدلے رافہ اور مجھ سے ہمیشہ کچھ زیادہ نمبر سمیٹ کر امی کا لاڈلہ بنا رہتا تھا۔ ابا بھی ریحان سے ہی اپنی ہر آس جوڑے بیٹھے تھے کیونکہ اس نے خاصے اچھے نمبروں کے ساتھ ایم اے پاس کر لیا تھا اور امید یہی تھی کہ جلد یا بدیر وہ ابا کے خوابوں میں رنگ بھرنے میں کامیاب ہو جائے گا۔

باقی رہا میں..... تو میری زندگی تو کٹ ہی رہی تھی۔ بی اے کے پرچے ختم ہونے کو تھے اور ہم سب حسب معمولی کیفے فراق میں اپنی مخصوص میز کے گرد سرشام سے ہی سر جوڑ کے بیٹھے تھے۔ باہر بارش تیز ہو چکی تھی اور بوندیں کیفے فراق کی ٹین کی چھت پر کسی بے ترتیب تال کی سرگم بکھیر رہی تھیں۔ چچا فراق کے کیفے کی ایک اور مخصوص نشانی..... یعنی ان کے ابا کے دور کا گراموفون بھی ہمیشہ کی بلیک اینڈ وائٹ دور کے نغموں کے سر بکھیر رہا تھا۔ ہم اکثر چچا کو چھیڑا کرتے تھے کہ اب اس گراموفون سے ان گلوکاروں یا مغنیوں کے گیتوں کے بجائے ان کی چیخیں روحوں کی آوازیں سنائی دیتی ہیں لہذا خدا کے لیے اسے بدل ڈالیں۔ مگر بدلے میں ہمیشہ ہمیں چند ناقابلِ اشاعت قسم کے کلمات سننے کو ملا کرتے تھے۔ اس بھیگی شام میں بھی گراموفون چرچار رہا تھا۔

”اے میرے دل کہیں اور چل.....“

غم کی دنیا سے دل بھر گیا..... ڈھونڈ لے اب کوئی گھر نیا.....“

رجبہ نے کل رات کی بچائی ہوئی سگریٹ کے ٹوٹے سے آخری کش باقاعدہ کشید کیا اور سگریٹ فضا میں اچھال دی۔

”ہاں یار..... اب تو دل یہی کہتا ہے کہ کہیں اور چلا جائے..... بھیا ہمارا تو اب اس ”بابو کا لونی“ میں دل نہیں لگتا.....“

بالے نے اپنے ہاتھ کی پرانی کچی Camy گھڑی پر نظر دوڑائی.....

”یار بڑی دیر کر دی اس کالج کے کلرک نے..... اب تک تو پرچہ آؤٹ ہو جانا چاہیے تھا۔ کہیں مروا ہی نہ دے..... میں نے بارہ لڑکوں

سے پیسے جمع کر کے خود اس کے حوالے کیے تھے۔ کہہ رہا تھا 12 بجے رات تک پرچہ پہنچا دے گا.....“

قریب سے گزرتے کیفے کے سدا بہار منشی مرزا نے بالے کی بات سن لی۔ ”جتنی محنت اور وقت تم لوگ پرچہ آؤٹ کروانے پر صرف کرتے

ہو۔ اس کا دس فیصد بھی اگر پڑھنے پر لگا دو تو تم سب کی فرسٹ ڈویژن آجائے گی۔“ مرزا آگے بڑھ گیا۔



مشی نے اپنی اداسی بھری نگاہیں اٹھائیں.....

”یار تم لوگوں کو اپنی پڑی ہے۔ کسی کو میرے اردو کے پرچے کی فکر نہیں ہے..... یقین کرو اس بار میرے ابا کم نمبر آنے پر میری جان ہی لے لیں گے.....“

مشی کی پریشانی بالکل بجاتھی۔ اس کے ابا محلے کے جزوقتی شاعر بھی رہ چکے تھے اور ان کا بیٹا پچھلی بار پرچے میں اقبال کا مشہور شعر کچھ اس طرح لکھ آتا تھا

پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر

نیل کے ساحل سے لے کر تاجاک کا شفر

ہم سب کی ہنسی چھوٹ گئی۔ راجہ نے اس کی ہمت بندھائی

”فکر نہ کرو..... مجھے پورا یقین ہے کہ نمبر دیتے وقت تمہارے ”شعری وزن“ کی داد ضرور دے گا۔..... شاباش.....“ بالے نے ایک گہری سانس لی ”آخری وار تک تو مجھے بھی گھر سے مل چکی ہے۔ مجھے سمجھ نہیں آتا کہ محمود غزنوی سترہ حملوں کی بجائے ایک ہی بار جی کڑا کر کے سومنات کی اینٹ سے اینٹ بجا دیتا تو تاریخ پر کیا فرق پڑ جاتا.....؟ کم از کم میں تو ان سترہ تاریخوں کے جھنجٹ سے نکل پاتا۔ ہر بار کہیں نہ کہیں ان سن اور تاریخوں کے جھیلے میں چوک جاتا ہوں.....“

”سنو لفتگو..... کیا ضروری ہے کہ ہر رات تم لوگوں کو باقاعدہ اعلان کر کے گھروں کو بھیجا جائے..... ابھی کچھ دیر میں ہی تم لوگوں کے گھروں سے پیغامات کا سلسلہ شروع ہو جائے گا..... پھر سب یہی کہیں گے فراق تم لوگوں کو بگاڑ رہا ہے.....“

راجہ نے دور سے ہی ہانک لگائی

”فکر نہ کرو چچا..... اب ہمیں مزید بگاڑنا ممکن نہیں.....“

ہم سب کہنے سے باہر نکلے تو بارش کچھ تھم سی گئی تھی، لیکن ہوا میں موجود نمی کے قطرے جھونکوں کے ساتھ ہمارے چہروں پر شبنم بکھیرنے لگے..... میں نے بالے اور راجہ کو یاد دلایا کہ صبح آخری پرچہ ہے لہذا وہ مجھے وقت پر گھر سے لیتے چلیں۔ گلی کے کٹڑ پر میں نے ان سب کو رخصت کرتے ہوئے ہاتھ ہلایا اور گلی میں داخل ہوتے وقت دل ہی دل میں گڑ گڑا کر دعا کی کہ ابا سو چکے ہوں۔ زمین سے کچھ کنکر چن کر میں نے وقفے وقفے سے تین کنکر صحن میں آہستگی سے اچھال دیئے۔ یہ میرے اور مجھ سے چھوٹی رافعہ کے درمیان بہت پرانا اشارہ مقرر تھا۔ کنکر صحن میں گرنے کی آواز سن کر وہ چپکے سے صحن کے اندر دروازے کی چٹائی اندر سے کھول دیتی تھی کیونکہ ابا کے فرمان کے مطابق ٹھیک عشاء کی نماز کے بعد گھر کا دروازہ بند کر دیا جاتا تھا۔ رافعہ کو میری اسی ”غیبی امداد“ پر بچپن سے لے کر اب تک درجنوں مرتبہ ابا سے سخت ڈانٹ پڑ چکی تھی لیکن وہ بھلا اپنے ”انوبھیا“ کورات کا کھانا کھلائے بغیر کب سکون کی خیند سو سکتی تھی۔ لہذا ہر بار اسی بے چاری کو ابا کے غیض و غضب کا نشانہ بننا پڑتا تھا۔

تیسرے پتھر کے چند لمحوں بعد صحن میں قدموں کی دھیمی سی آواز ابھری اور پھر رافعہ نے دھیرے سے دروازہ کھول دیا۔

”آیا ان بھیا..... آپ آج بھی اتنی دیر سے آئے ہیں.....؟..... پتہ ہے ابا کتنے غصے میں تھے.....؟.....“ میں نے کندھے اچکائے ”یہ

کون سی نئی بات ہے..... مغل اعظم کا پارہ ہمیشہ ہی بلند رہتا ہے.....“ رافعہ نے مجھے گھورا..... ”انوبھائی..... بری بات.....“

”ارے یار ہم مغل ہیں..... تو ابا مغل اعظم ہوئے ناں اس گھر کے..... اچھا بہت بھوک لگی ہے..... کچھ کھانے کو بھی ملے گا یا پھر یونی کھڑی میرا سر کھاتی رہو گی.....؟“

رافعہ جلدی سے باورچی خانے کی طرف پلٹی۔ ”تین مرتبہ گرم کر چکی ہوں“

”وہ پڑھا کو پروفیسر کہاں ہے۔ سو گیا کیا.....؟“ میں نے باورچی خانے میں پڑی چوکی گھسیٹی اور وہیں بیٹھ گیا۔ رافعہ نے سالن گرم کرنے کے لیے چولہے کو آگ دکھائی۔ ”اس طرح پکارتے ہیں اپنے بڑے بھائی کو..... پورے ڈیڑھ سال بڑے ہیں ریحان بھی آپ سے.....“

”سب تاریخ پیدائش کا چکر ہے..... ڈیڑھ سال پہلے میں پیدا ہوا ہوتا تو آج میں بڑا ہوتا.....“ میں نے پہلا نوالہ منہ میں رکھا ”بھائی..... کیوں ایسی باتیں کرتے ہیں آپ..... پتہ ہے ابا آپ کی تعلیم اور نوکری کے لیے کتنے پریشان رہتے ہیں..... اور امی تو آپ کی فکر میں پہلے سے بھی آدھی رہ گئی ہیں..... آخر آپ ان دونوں کی بات پر کان کیوں نہیں دھرتے.....“

میں نے چڑ کر ہاتھ جوڑے ”خدا کے لیے چھوٹی..... اب تم میری نانی اماں بننے کی مشق شروع نہ کرو..... یہ کام امی ابا کے لیے ہی چھوڑ دو..... اور پھر مجھ سے جو بھی بن پڑتا ہے کرتا تو ہوں..... لیکن اگر ابا یہ سمجھتے ہیں کہ بی اے کرتے ہی وزیراعظم لگ جاؤں تو یہ میرے لیے ناممکن ہے..... آخر تم سب کو یہ بات سمجھ میں کیوں نہیں آتی کہ یہ سرکاری باجو گیری میرے بس کا روگ نہیں ہے..... مجھ سے نہیں ہوتی یہ سرکاری چوٹیں گھسنے کی غلامی..... اس قربانی کے لیے ریحان موجود ہے..... بکرا بننے کے لیے..... مجھے تو تم لوگ بخش ہی دو.....“

میری آواز بلند ہوتے دیکھ کر رافعہ نے جلدی سے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا لیکن شاید تب تک بہت دیر ہو چکی تھی۔ اچانک میرے عقب میں ابا کی گر جتی ہوئی آواز سے ماحول کانپ سا گیا۔

”مل گئی فرصت گھر آنے کی..... اب بھی آنے کی کیا ضرورت تھی صاحبزادے..... ابھی تو آدھی رات باقی پڑی تھی آوارہ گردی اور لوفر گیری کرنے کے لیے..... میں پوچھتا ہوں یہ کون سا وقت ہے گھر واپس آنے کا..... یہ گھر ہے یا کوئی سرائے.....؟؟“

رافعہ جو پہلے سے ہی گھبرا کر کھڑی ہو چکی تھی اس نے مجھے نظروں ہی نظروں میں کھانا جلدی ختم کرنے کا اشارہ کیا۔ میں بادل نخواستہ پانی کا ایک لبا سا گھونٹ لے کر کھانا ادھورا چھوڑ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ چھوٹی جاتی تھی کہ ابا کے قہر و غضب سے بچنے کا بہترین طریقہ یہی ہے کہ فی الوقت ان کی آگ برساتی نظروں سے دور ہٹ جایا جائے۔ ابا کی آواز سن کر اندر سے امی اور ریحان بھی بوکھلائے ہوئے سے باہر نکل آئے۔ میں سر جھکا کر چھت کی سیڑھیوں کی جانب بڑھاتا کہ اوپر بنے جزوقتی گودام اور کل وقتی اس ”کمرہ نما“ میں جا کر پڑھوں جو بچپن سے اب تک میری آخری پناہ گاہ تھا، لیکن میرا قدم اٹھتے ہی ابا ایک بار پھر زور سے چلائے۔

”کہاں چل دیے..... رکو..... آج ایک بات کا فیصلہ ہو کر رہے گا۔“

ریحان اور چھوٹی نے گھبرا کر امی کی طرف دیکھا۔ میرے سیڑھیوں کی طرف بڑھتے قدم رک گئے۔





## باب 2

مجھے اس سے پہلے بھی کئی مرتبہ راتوں کو دیر تک گھر سے غائب رہنے پر ڈانٹ پڑ چکی تھی لیکن آج مغل اعظم کا پارہ واقعی ساتویں آسمان کو چھو رہا تھا۔ امی نے کمزوری مدافعت کرنے کی کوشش کی۔

”اب جانے بھی دیں..... رات بہت ہو گئی ہے..... صبح بات کر لیں گے.....“

ابا پھر گرجے ”خبردار..... آج کوئی بیچ میں نہیں بولے گا..... اور رافعد کی ماں..... تمہاری اسی طرف داری نے اس لوفز کو آج اس مقام پر پہنچا دیا ہے۔ لوگ میری پیٹھ پیچھے ہنستے ہیں کہ سارے زمانے کو اصولوں کا سبق دینے والے ماسٹر تو قیر کی اپنی اولاد اس کے کہے میں نہیں ہے..... ہاں تو میاں..... آج صاف صاف بتا دی دو کہ کب تک یونہی ہمارے سینوں پر مونگ دلتے رہو گے..... تمہاری یہ آوارہ گردیاں کب ختم ہوں گی.....“

میں نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھلنا چاہا۔ امی نے ابا کے عقب سے مجھے گھور کر خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ ریحان نے بھی غیر محسوس طور پر ہاتھ جوڑے۔ میں نے ہتھیر ڈال دیے۔

”جی..... کوشش کروں گا کہ آئندہ دیر نہ ہو.....“

لیکن میرا یہ کہنا ہی غضب ہو گیا۔ آتش فشاں پھٹ پڑا.....

”کوشش..... بہت خوب..... سنتی ہو رافعد کی ماں..... ابھی بھی یہ لوفز صرف کوشش کرے گا۔ آج اس کی بڑی پہلی ایک نہ کی تو میرا نام بھی تو قیر احمد نہیں ہے.....“

ابا اپنی چھڑی سنبھال کر میری طرف لپکے۔ امی جلدی سے ان کی راہ میں مزاحم ہو گئیں اور چھوٹی نے فوراً لپک کر ابا کی چھڑی پکڑ لی، لیکن مسئلہ یہ تھا کہ ابا صحن میں ٹھیک وہاں کھڑے تھے جہاں چھت پر جانے کے لیے سیڑھیوں کی ایک چھوٹی سی ڈیوڑھی بنی ہوئی تھی لہذا میرے پاس اپنے کمرے کی طرف بڑھنے کے تمام راستے مسدود ہو چکے تھے۔ امی اور رافعد ابا کی منت سماجت میں مصروف تھیں لہذا میرے پاس گھر سے باہر نکل جانے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ میں صحن کا دروازہ کھول کر باہر گلی میں نکل گیا۔ پہلے تو سوچا کچھ دیر یہیں گلی میں کھڑے رہ کر اس لاوے کے سرد ہونے کا انتظار کروں لیکن پھر دوسرے ہی لمحے ابا کے چلانے کی آواز آئی ”ریحان..... دروازہ بند کر دو..... ایک رات باہر کی ہوا کھائے گا تو ہوش ٹھکانے آجائیں گے اس بد معاش کے.....“ گھر کے اندر کچھ دبا دبا سا احتجاج ابھرا لیکن پھر آخر کار اندر سے صحن کے دروازے کی چنجی چڑھائے جانے کی آواز گلی میں گونجی..... میں جانتا تھا کہ مغل اعظم اپنے فیصلے واپس لینے کے عادی نہیں ہیں۔ لمحے بھر میں میرے مغل خون نے بھی جوش مارا ”ٹھیک ہے اگر مغل شہنشاہوں کو دیس نکالا دینے کی عادت ہے تو مغل شہزادے بھی اپنی سلطنت کو ٹھوکر مار کر خاک چھاننے کا ہنر جانتے ہیں۔“ سو میں بھی ابا کے اس دو کمروں کے سرکاری کوارٹر کی ریاست کو ٹھکرا کر رات گزارنے کے لیے کسی جزیرے کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ جزیرہ اس لیے کہ فی الحال تو

سارا شہر بارش کے بہتے پانی کی وجہ سے ایک چھوٹے دریا کا منظر پیش کر رہا تھا۔ میں نے اپنی شرٹ کے کالر کھڑے کر لیے کیونکہ تیز بوندوں نے ایک بار پھر زمین کو جل تھل کرنے کے لیے سازش باندھ لی تھی۔ جانے بارش کا واسطہ ہمیشہ غریب کے کچے گھر وندے سے ہی کیوں ہوتا ہے؟ یا پھر امراء کے محلوں پر برسنے والی بارش شاید کوئی اور ہوتی ہوگی.....؟؟؟

پہلے میں نے سوچا کہ کالونی سے نکل کر سڑک کے اگلے چوراہے سے متصل سڑک پر واقع بالے کے ابا کے گیراج چلا جاؤں، لیکن جانے کالونی سے نکلتے ہی میرے قدم خود بخود کیسے فراق کے باہر بچھے لکڑی کے بیخ نما تنکوں کی جانب کیوں بڑھتے گئے۔ کیفے کے لکڑی سے بنے چاروں دروازے تو بند تھے لیکن کھڑکیوں سے چھن کر سڑک پر گرتی روشنی کے مستطیل ٹکڑے اس بات کا پتہ دے رہے تھے کہ اندر صبح کے ناشتے کی تیاریاں شروع ہو چکی ہیں۔ کیفے فراق کی حلوہ پوری سارے شہر میں مشہور تھی اور صبح منہ اندھیرے ہی شہر سے باہر موجود سینما کی فیکٹری کو جانے والے پہلی شفٹ کے بہت سے مزدور یہیں سے ناشتہ کر کے صبح چھ بجے والی پہلی بس پکڑتے تھے۔

بارش تیز ہو چکی تھی۔ میں ٹین کی چھت والے برآمدے کے نسبتاً خشک حصے میں پڑے ایک تختے کی جانب بڑھ گیا۔ اندر سے چائے کی سوندھی اور کچھ بے چین سی کر دینے والی مہک باہر کیفے کے برآمدے تک آرہی تھی۔

اگر صبح کا واحد تعارف روشنی اور سورج کے طلوع ہونے سے ہی تھا تو ابھی صبح ہونے میں کافی دیر باقی تھی۔ میں کچھ دیر تک بیخ پر لیٹا سڑک پر گرتی بوندوں کے فنا ہونے کا کھیل دیکھتا رہا۔ پھر نہ جانے کب نیند کی روٹھی پری میری پلکوں کے مورچھل سے آکر لپٹ گئی اور میں نے آنکھیں موندھ لیں شکر ہے، ہر غریب کو امیروں کی طرح نیند خریدنی نہیں پڑتی۔ مجھے سوئے کچھ ہی دیر گزری ہوگی کہ اچانک مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے دھیرے سے میرا شانہ ہلایا ہو۔ چند لمحوں کے لیے میں بھول گیا کہ میں اپنے گھر میں نہیں سڑک کنارے سو رہا ہوں۔ مجھے لگا جیسے حسب معمول دیر تک سونے کی وجہ سے چھوٹی مجھے چھت پر جگانے آئی ہے۔ میں نے نیند میں اپنا غصہ نکالا ”کیا مصیبت ہے..... سونے دونا.....“

”معافی چاہتا ہوں بر خوردار..... وہ دراصل..... میں.....“

ادھ کھلی پلکوں سے میں نے اپنے سامنے بارش میں شرابور ایک بزرگ کو پریشان کھڑے دیکھا۔ میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔

”میں تمہاری نیند خراب نہیں کرنا چاہتا تھا..... لیکن مجبوری ہی کچھ ایسی آن پڑی تھی..... گھر والی اور بچیاں میرے ساتھ ہیں اور بارش ہے کہ تمہنے کا نام نہیں لے رہی.....“

سڑک کے کنارے ایک عورت اور دو لڑکیاں ہاتھ میں کپڑے کی چند گٹھنیاں تھامے، ٹین کے ایک صندوق کے قریب کھڑی، خود کو بارش سے بچانے کی ناکام کوششیں کر رہی تھیں۔ ماں اور ایک لڑکی باقاعدہ برقعے میں اور دوسری لڑکی نے بھی مناسب پردہ کر رکھا تھا، لیکن جیز ہوا کے تھیرے انہیں بار بار سر کا پلوٹھیک کرنے پر مجبور کر رہے تھے۔ سر کا پلو عورت کا سائبان ہوتا ہے لیکن طوفان کو بھی تو سدا ہی سائبانوں سے سروکار رہا ہے۔

میں نے سر جھٹک کر اپنے حواس بحال کیے۔

”جی فرمائیے.....“



# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

## یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

### ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بُک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✧ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریج
- ✧ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شرٹک نہیں کیا جاتا
- ✧ ہر ای بُک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو مائیل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بُک کا پرنٹ پریویو
- ✧ ہر پوسٹ کے ساتھ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریج
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

**We Are Anti Waiting WebSite**

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

# WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on  
Facebook

[fb.com/paksociety](https://fb.com/paksociety)



[twitter.com/paksociety1](https://twitter.com/paksociety1)



بزرگ نے اپنی بات کا سلسلہ جوڑا ”دراصل ہم لوگ ابھی کچھ دیر پہلے ہی نور پور کی گاڑی سے اترے ہیں۔ ٹرین کو کل شام پانچ بجے اس شہر کے پلیٹ فارم سے لگنا تھا لیکن سیلابی پانی کی وجہ سے رات تین بجے پہنچی۔ جنہوں نے ہمیں اسٹیشن لینے کے لیے آنا تھا وہ نہ جانے کب تک ہمارا انتظار کرنے کے بعد واپس جا چکے ہیں۔ میں اس شہر میں نو وارد ہوں۔ تانگے والے کو جو پتہ زبانی یا دھادھی بتا دیا لیکن یہاں اترنے کے بعد اندازہ ہو رہا ہے کہ شاید ہم کسی غلط جگہ اتر گئے ہیں۔ یہ سادات محلہ نہیں ہے۔“

”سادات محلہ یہاں سے زیادہ دور تو نہیں لیکن آپ اس برقی بارش میں خواتین کو لے کر وہاں تک پہنچیں گے کیسے.....؟“

میری بات سن کر بزرگ نے کچھ تامل کیا۔

”میاں..... اسی لیے تو تمہیں سوتے سے جگایا ہے۔ میں جانتا ہوں تم دن بھر کی محنت مشقت کے بعد ہی یوں لمبی تان کر سوئے ہو گے..... لیکن اگر تم ہمیں سادات محلے کے اس مکان تک پہنچا دو تو میں معقول مزدوری دوں گا تمہیں.....“

مجھے کیفے کے باہر یوں بیٹھ کر سوتا دیکھ کر شاید وہ مجھے کیفے کا ہی کوئی ملازم یا مزدور سمجھے تھے۔ اس میں ان کا کچھ زیادہ قصور بھی نہیں تھا۔ اس وقت میرا حلیہ ہی کچھ ایسا تھا۔ یا شاید میں نے فٹ پاتھ سے لگے جس بیٹھ کا اپنا بستر بنا رکھا تھا۔ اس مقام نے انہیں یہ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا؟ اگر میں اسی حلیے میں کسی بیچ ستارہ ہوٹل کے کمرے میں سو رہا ہوتا تو لوگ اسے میرا ”بے تکلف بر Non-formal behaviour“ گردانتے، شاید ہمارے ظاہری حلیوں سے کہیں زیادہ ہمارے آس پاس کا ماحول ہمارے تعارف پر اثر انداز ہوتا ہے.....

میں نے کچھ کہے بغیر ان کے ہاتھ میں دہلی کاغذ کی وہ پرچی پکڑ لی جس پر سادات محلے کا پتہ لکھا ہوا تھا۔ ”مکان نمبر 13، گلی نمبر 7، سادات محلہ“ پرچی کے دوسری جانب کسی تو ریل کی کا نام لکھا ہوا تھا۔ میں نے کاغذ اپنی جیب میں ڈال لیا۔ ”چلیے.....“

میں نے بڑے میاں کا جواب سنے بغیر قدم بڑھا دیے۔ پیچھے سے ان کی کم زوری آواز ابھری۔

”میاں..... صندوق تو اٹھا لو.....“

میں نے ایک لمبی سی سانس بھری اور دل ہی دل میں خود کو کوسا

”برے پھنسنے آیاں میاں..... اور لو سڑک کے کنارے کھلی فضا میں سونے کے مزے.....“ میں نے بادل خواست سڑک پر پڑا ٹین کا صندوق اٹھایا۔ جانے کیا پتھر ڈال رکھے تھے بڑے میاں نے صندوق میں..... توقع کے خلاف وزن کی زیادتی کی وجہ سے ایک لمحے کے لیے میرے قدم لڑکھڑاسے گئے، چہرے کو نقاب میں چھپائے ہوئے بنا برقعے والی لڑکی کڑک کر بولی ”ٹھیک سے اٹھاؤ..... بہت نازک اور قیمتی چیزیں ہیں اندر، کہیں گرانہ دینا سب کچھ.....“ غصے سے میرے خون کا بہاؤ تیزی سے میری کن ٹیوں کی طرف دوڑا۔ جی میں آئی کہ صندوق وہیں سڑک پر پھینک کر ہاتھ جھماڑ لوں کہ ”بی بی یہ لو..... سنبھالو اپنا قیمتی سامان..... آیاں احمد نے آج تک گھر میں اٹھ کر پانی کا گلاس تک نہیں پیا..... اور یہ محترمہ صندوق اٹھانے کا درس دے رہی ہیں؟“ میں نے زور سے صندوق سڑک پر بیچ دیا۔ سناٹے میں دور تک کچھ ایسی آواز گونجی جیسے کسی نے بہت اونچی عمارت سے ملبہ زمین پر پھینک دیا ہو۔ برقعوں کے اندر کچھ پلچل سی مچی اور لڑکی چلائی۔ ”ارے ارے..... دیکھ کر.....“

لیکن جب تک بڑے میاں میرے برتاؤ کا کچھ نتیجہ اخذ کر چکے تھے۔ وہ جلدی سے آگے بڑھے۔

”میاں تم اس کی بات کا برا نہ منانا..... نادان بچی ہے۔“

پھر وہ لڑکی کی طرف پلٹے اور انتہائی غصیلی لیکن دھیمی آواز میں بھڑکے۔

”گہنا..... اب تم کچھ نہیں بولوگی..... سمجھ گئیں.....“ لڑکی نے دبی آواز میں خود سے کچھ بڑبڑاہٹ کی، لیکن جواباً کچھ نہ بولی۔ اچھا..... تو

اس نادان بچی کا نام گہنا تھا۔ بڑے میاں نے صندوق کی دوسری جانب کا کنڈا اپنے ہاتھ میں پکڑ لیا..... ”چلو صاحبزادے..... میں تمہارا وزن کچھ ہلکا کیے دیتا ہوں۔..... ہم دونوں اسے اٹھا لیں گے۔“

میں نے آہستگی سے ان کا ہاتھ ایک جانب کر کے صندوق خود اٹھایا اور آگے چل پڑا۔ لڑکی نے بڑے میاں سے نظر اور زبان بچاتے ہوئے غصے میں طنزیہ جملہ پھینکا ”بڑے نخرے ہیں اس قلی کے بھی۔“

میں نے سنی ان سنی کردی کیونکہ بارش کی وجہ سے بزرگ اب ہلکے ہلکے کاپٹے سے لگے تھے۔ ہم سب بارش میں بھگی سڑک پر چھپ چھپ کرتے قریباً 20 منٹ میں سادات محلے پہنچ گئے۔ اینٹ سے جنی گلیوں کے لیمپ پوسٹ ابھی روشن تھے لہذا مطلوبہ مکان ڈھونڈنے میں زیادہ دقت پیش نہیں آئی۔ دوسری ہی دستک پر اندر سے لپکتے جھپٹتے ایک چھبیس ستائیس سالہ نوجوان آنکھوں پر نظر کا چشمہ لگائے برآمد ہوا اور بزرگ کو دیکھتے ہی لپک کر ان کے گلے لگ گیا۔ پتہ چلا کہ یہی تو بریلی صاحب ہیں اور بزرگ جن کا نام شیخ کبیر تھا نور پور کے حالیہ سیلاب میں اپنا سب کچھ ڈوبنے کے بعد اپنی مرحومہ بہن کے بیٹے کے پاس ہمارے شہر میں پھر سے ایک نئی زندگی کی ابتداء کے لیے اترے تھے۔ ماموں بھانجا کچھ دیر تک دروازے پر ہی گلے شکوے کرتے رہے اور برقعے والی بڑی عمر کی عورت تویر کی بلائیں لیتے نہ تھکی تو مجبوراً مجھے ہلکے سے کھٹک کر انہیں احساس دلانا پڑا کہ ان قیمتی جذبات کا اظہار وہ گھر کے اندر جا کر بھی کر سکتے ہیں۔ میرے کھانسنے پر بڑے میاں چونکے اور جلدی سے اپنی واسکٹ کی جیب سے بیس بیس کے دونوٹ نکال کر میری طرف بڑھے ”معاف کرنا میاں..... موقع ہی کچھ ایسا تھا کہ من بہک گیا۔ میں تو بے دھیانی میں تمہارا نام پوچھنا بھی بھول گیا تھا۔ لو یہ رکھ لو..... تم نے اس برستی بارش میں بڑی ہمت دکھائی۔“ میں نے روپے ان کے ہاتھ سے لے کر ان کی واسکٹ کی اوپر والی جیب میں ڈال دیے۔

”میرا نام آیا ان ہے..... اور میں قلی نہیں ہوں۔“

میں نے واپس پلٹتے وقت کڑی نظروں سے خود کو قلی کے عہدے پر فائز کرنے والی ”نادان“ کو دیکھا اور چل پڑا۔ بڑے میاں چند لمحوں کے لیے تو ہکا بکا سے ہی رہ گئے اور پھر میرے پیچھے لپکے ”ارے میاں..... یہ کیسے..... میرا مطلب ہے..... دو گھڑی ہماری بات تو سن لو.....“

لیکن میں رکے بنا اس گلی سے نکل آیا۔ قریبی مسجد سے فجر کے نمازی نکل رہے تھے۔ مطلب صبح ہونے کو تھی، لیکن گھنٹے بادلوں اور بارش کی وجہ سے ابھی تک دھندلا بہت گہرا تھا۔ مرکزی سڑک پر دو دو والے گوالے اور اخباری ہاکرا اپنی اپنی سائیکلوں پر بھونپو بجاتے، سڑک پر بہتے پانی میں تیزی سے دوڑتے سانپ جیسی لکیریں بناتے، شہر میں نکل آئے تھے۔ میں بھی پوری طرح بھیگ چکا تھا۔ کچھ سائیکل سواروں نے سر پر کشتی نما پلاسٹک کی ٹوپیاں اوڑھ رکھی تھیں جو ان کے لیے عارضی چھتری کا کام دے رہی تھیں، لیکن کچھ میری طرح سدا کے بے سائبان بھی تھے جنہیں مفلسی کی وجہ

سے طوفانوں میں کچھ لٹ جانے کا خوف نہ تھا۔

میں جب ”کینے فراق“ کے کٹر ٹیک پہنچا تو سیاہ گھٹاؤں کے پیچھے سے ابھرتی دودھیا گلابی روشنی نے ماحول پر کسی کم طاقت والے زرد بلب کا اجالا پھیلا دیا تھا۔ مجھے دور سے ہی ریحان اسی شیخ پر چھتری تانے بیٹھا نظر آ گیا جہاں اب سے گھنٹہ بھر پہلے میں خود کو استراحت تھا۔ ریحان مجھے آتا دیکھ کر جلدی سے کھڑا ہو گیا۔

”کہاں تھے تم..... میں ریلوے اسٹیشن اور بالے کا گیراج بھی دیکھ آیا ہوں..... یہ کوئی وقت ہے مڑ گشتی کرنے کا؟“ ریحان نے ہنسی چھتری کو ہوا میں جھاڑ کر اسے دوبارہ ہم دونوں کے سروں پر تان لیا۔ جانے کیوں مجھے اسٹیشن کا ذکر سن کر غصہ آ گیا ”کیوں..... تم مجھے ڈھونڈنے ریلوے اسٹیشن کیوں گئے تھے..... میرا فی الحال وہاں قلی بھرتی ہونے کا کوئی ارادہ نہیں ہے.....“ ہمیشہ کی طرح ریحان نے فوراً ہتھیار ڈال دیے۔

”اچھا گھر چلو..... اسی ساری رات تمہاری وجہ سے سوئی نہیں ہیں..... آج تمہارا پرچہ بھی تو ہے.....“ ”کیوں.....؟“ مغل اعظم نے میرے دیس نکالے کا فرمان واپس لے لیا ہے کیا.....؟..... مجھے نہیں جانا ہے واپس..... جا کر کہہ دو سب سے.....“ ریحان نے فوراً گلے میں پڑا ہوا مغل اتار کر اسے میری کمر کے گرد کس کر پکڑ لیا۔ ”تمہارے تو اچھے بھی واپس جا کیں گے..... جلوسیدھی طرح گھر.....“ یہ اس کا بہت پرانا اور آزمودہ طریقہ تھا۔ بچپن میں جب میں امی یا ابا سے کسی بات پر روٹھ کر کالونی سے باہر کھیل کے میدان میں شام تک چھپا بیٹھا رہتا تھا تو تب بھی ریحان مجھے ڈھونڈ چکنے کے بعد اسی طرح مغل، پتلون کی سیٹ یا کسی رسی وغیرہ سے باندھ کر کھینچتے ہوئے گھر تک لے جاتا اور امی کے حضور پیش کر دیتا تھا۔ اس روز بھی یہی ہوا۔ آس پاس سے گزرتے اجنبی حیرت سے یہ ماجرا دیکھ رہے تھے کہ قریب ایک ہی عمر کے دو لڑکوں میں سے ایک دوسرے کو مغل سے باندھ کھینچ لے جا رہا ہے اور دوسرا لڑکا جھگڑتا پہلے کے پیچھے روانہ ہے۔ محلے کے چند بزرگ جو نماز سے فارغ ہو کر اپنے گھروں کو جا رہے تھے وہ ایک بار پھر وہی برسوں سے دھرایا جانے والا کھیل دیکھ کر زیر لب مسکرائے۔ چند ایک نے ہنس کر ریحان کو داد دی ”شاباش ریحان بیٹا..... جانے نہ پائے یہ بد معاش آیاں.....“ ”ذرا کس کے پکڑنا اس شیطان کو.....“ تیسرے بڑے میاں منمنائے ”اب آیا ناں اونٹ پہاڑ کے نیچے..... بھئی یہ ریحان ہی ہے جو اس آفت کو قابو کر سکتا ہے.....“

کچھ ہی دیر میں ہم دونوں گھر کے صحن میں موجود تھے جہاں امی برآمدے میں پریشانی سے ٹہل رہی تھیں۔ میری حالت دیکھ کر انہوں نے بنا کچھ کہے تو لیے سے میرے بال خشک کرنا شروع کر دیے اور رافعہ جلدی سے دھلے ہوئے کپڑوں کا جوڑا استری کر لائی۔ امی کی ناں اسناپ نصیحتوں کا پٹارہ کھل چکا تھا۔

”انو..... کیوں ستاتا ہے اپنی ماں کو ہر وقت..... بات کیوں نہیں مان لیتا اپنے ابا کی.....؟..... وہ تیرے بھلے کے لیے ہی تو کہتے ہیں.....“ میں نے دل ہی دل میں ان کے آگے کہے جانے والے جملے اپنے دل میں دھرا نا شروع کر دیے۔ ”کوئی باپ اپنی اولاد کا دشمن نہیں ہوتا.....“ ”تو نہیں جانتا کہ انہوں نے کس مشکل سے تم تینوں کی پرورش کی ہے“ وغیرہ وغیرہ۔ اور پھر آخر میں امی نے ایک بار پھر ابا کی ان ”قربانیوں“ کا ذکر کیا جو ہم تینوں بچوں سے ابھی تک پوشیدہ تھیں۔ میں حسب معمول ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے نکالتا رہا۔ کچھ ہی دیر بعد گلی میں بالے کی



پھٹ پھٹا کا سا نلنسر غرا نے لگا۔ میرے ابا کے ڈر سے وہ صرف ایک بار ہارن دے کر پھر وقفے وقفے سے موٹر سائیکل کو صرف ریس دیتا رہتا تھا، لیکن آج ابا محن میں کہیں نظر نہیں آرہے تھے۔ ویسے بھی جس رات دیر سے ان کا مجھ پر قہر نازل ہوتا تھا اس کی اگلی صبح وہ میرا سامنا کرنے سے گریز ہی کرتے تھے۔ امی مجھے زبردستی ناشتہ کراتی رہ گئیں اور میں بھگم بھاگ بالے کے ساتھ یونیورسٹی پہنچا۔ ”اردو“ میرے لیے ہمیشہ ہی سے بہت سہل تھی۔ شاید اردو میڈیم ہونے کا بس یہی ایک فائدہ ملا تھا مجھے۔ جبکہ بالے اور راجہ کا پرچہ کچھ خاص نہیں ہوا۔ حسب معمول گھر والی سی پر راجہ اور بالے میں یہی بحث ہوتی رہی کہ جانے ممتحن کو ان سے آخر ایسی کیا دشمنی تھی کہ جب وہ میرا سودا پڑھ کر جاتے تو پرچے میں غالب ہوتا اور جس دن غالب کا دیوان گھول کر پینے کے بعد پرچہ دینے بیٹھتے تو اقبال وہاں براجمان ملتے..... ان دونوں نے طے کر لیا کہ آئندہ وہ دماغ کے بجائے کوٹ اور واسکٹ کی جیبوں میں ان شاعروں کی سوانح عمریاں اور کلام بھر کر لے جائیں گے۔

بارش کچھ تھم چلی تھی لیکن گھٹائیں اب بھی آسمان پر ایک دھانی آچل اوڑھے ہوئے تھیں۔ ایسا آچل جس کے کناروں پر سرسری رنگ کی گوشت کناری جڑی ہوئی ہو..... بالے نے راستے ہی میں اعلان کر دیا تھا کہ ایسے ”قاتل موسم“ میں کیفے فراق سے ادھار گرم سو سے اور چائے پئے بنا گزرنا گناہ کبیرہ ہوگا۔ لہذا ہم سب اپنے گناہ بخشوانے کیلئے فراق چاہتے۔ مجھے دور سے دیکھتے ہی کیفے کا نشی مرزا دور سے چلایا ”ارے یہ رہا اپنا آیاں..... بھئی یہ صاحبان بہت دیر سے تمہاری راہ دیکھ رہے ہیں“ میں نے مرزا کی نگاہوں کے تعاقب میں نظر دوڑائی۔ سامنے والی میز سے دو افراد اٹھ کر پلٹے۔ وہ گزشتہ رات والے شیخ صاحب اور توہر تھے۔



## خدا اور محبت

**خدا اور محبت** بہت ہی خوبصورت اور رومانی ناول ہے جو مصنف ہاشم ندیم کی اپنی محبت کی سچی داستان پر مبنی ہے۔ یہ مصنف ہاشم ندیم کا پہلا ناول ہے اور اس کی کہانی کونستہ اور لندن شہر کے پس منظر میں لکھی گئی ہے۔ یہ ناول ایک پرائیوٹ جینرل پر ڈرامائی شکل میں بھی پیش کیا جا رہا ہے۔ اس ناول کو نیشنل اور انٹرنیشنل دونوں سطح پر بہت سراہا گیا ہے اور بہت جلد علم و عرفان پبلیکیشنز والے اس ناول کا انگریزی ایڈیشن لندن سے شائع کرنے والے ہیں۔

یہ ناول کتاب گھر پر دستیاب ہے۔ جسے **ناول** سیکشن میں دیکھا جاسکتا ہے۔

## باب 3

میں ان دونوں کو وہاں اپنا انتظار کرتے دیکھ کر کچھ چونک سا گیا لیکن شیخ صاحب مجھے دیکھتے ہی کچھ اس وارنگلی سے میری جانب لپکے جیسے ہماری برسوں کی شناسائی ہو۔ ”یہ کیا میاں..... تم تو رات ناراض ہو کر یوں چل دیے کہ پھر دوبارہ پلٹ کر خبر بھی نہ لی۔ سچ پوچھو تو مجھے شرمندگی کے مارے ساری رات نیند نہیں آئی اور صبح ہوتے ہی تنویر میاں کو لے کر تمہاری تلاش میں نکل پڑا۔ بھلا ہوا ان مرزا صاحب کا جنہوں نے ہمیں یہیں روکے رکھا اور نہ ہم تو تمہارے گھر جانے والے تھے۔“ میرے دوستوں نے بھنوں اچکا کر مجھ سے بڑے میاں کا تعارف پوچھا اور پھر میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی شیخ صاحب نے رات کا تمام ماجرا من و عن بیان کر دیا۔ میں نے درمیان میں بڑی کوشش کی کہ وہ ”قلی“ والا حصہ حذف کر جائیں مگر کہاں جناب.....؟ وہ بھی پوری کہانی سنا کر ہی دم لینے کو رکے۔ درمیان میں راجہ، بالا اور مٹھی جان بوجھ کر میرا ریکارڈ لگانے کے لیے ٹھوکے دیتے رہے ”اچھا..... تو انو نے آپ کا بکس بھی گھر تک پہنچایا.....؟ کمال ہے..... بھئی کچھ بھی کہو..... ہمارا آیاں ہے بڑا فرمانبردار اور سعادت مند بچہ..... قلی ہو تو ایسا..... مزہ آگیا.....“ آخر میں تینوں شیطان یک زبان ہو کر بولے ”جیتے رہو بیٹا آیاں..... ہم سب کو تم پر فخر ہے.....“ شیخ صاحب اپنی ہی دھن میں بولے جارہے تھے۔ ”ہاں ہاں..... تم سب کو اپنے دوست پر فخر تو ہونا ہی چاہئے..... آج کل کون کسی کے لیے اتنا کرتا ہے۔“ میں نے خون کے گھونٹ پیتے ہوئے اپنے گروہ کی جانب دیکھا اور شیخ صاحب سے پوچھا ”آپ نے صرف میرا شکریہ ادا کرنے کے لیے اتنی زحمت کیوں اٹھائی..... مجھے جو ٹھیک لگا وہ میں نے کیا“ لیکن شیخ صاحب اپنی ہی بات پراڑے رہے اور آخر کار بڑی مشکل سے یہ وعدہ لے کر واپس پلٹے کہ میں پہلی فرصت میں ان کی طرف حاضری دوں گا۔ میری طرف سے راجہ اور بالے نے بڑے خشوع و خضوع سے انہیں یقین دلایا کہ مجھے شیخ صاحب کی طرف لے کر آنا اب ان کی ذمہ داری ہے۔ لہذا وہ بے فکر ہو کر گھر جائیں اور ہماری آمد کا انتظار اور استقبال کی تیاری کریں۔ ان کے جانے کے بعد میں اپنے دوست نمادشمنوں کی طرف پلٹا ”یہ سب کیا تھا.....؟ تم لوگ کبھی نہیں سدھر سکتے..... کیا ضرورت تھی ان کے سامنے یہ ساری بکواس کرنے کی.....“ لیکن وہ تینوں میری کوئی بات سنتے تب ناں..... وہ بمشکل اپنے جھپٹوں کو روک کر مجھے کریدتے رہے ”اچھا انو..... یہ تو بتا یا..... وہ تھی کیسی..... جس نے تجھے قلی کا خطاب دے دیا.....“ ”ہاں بیٹا..... ہم سب سمجھتے ہیں تیری اس ”خدمت غلطی“ کو..... بیٹے کا بیٹا کچھ دیکھ کر ہی گرتا ہے۔ ضرور..... کچھ نہ کچھ تو کالا ہے دال میں..... سچ بتانا..... کیسی دکھتی تھی وہ اور وہ بڑی والی کیسی تھی.....“ میرا پارہ اب آسمان کو چھونے لگا تھا۔ آخر کار میں پھٹ پڑا ”کیا بتاؤں کیسی دکھتی تھیں وہ..... دونوں درجن گز بھر ٹنٹ نما برقعوں اور چادروں میں ملبوس تھیں..... آنکھ بھی بس ایک ہی اور بقدرے ضرورت باہر نکال رکھی تھی..... بس..... ہوئی تلی..... یا مزید کچھ بتاؤں.....“ میری بات سنتے ہی ان تینوں کے ارمانون پر اوس پڑ گئی ”کیا..... برقعے میں..... دھت تیرے کی.....“ ہم سب جانتے تھے کہ ہماری زندگیوں میں ایسے کسی شٹل کاک برقعے والی کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔

اگلے چند روز نتیجہ نکلنے تک ہماری چھٹیاں تھیں لہذا میں نے رابطہ اور بالے کو سختی سے منع کیا کہ خبردار جو کسی نے مجھے صبح گیارہ بجے سے پہلے جگانے کی کوشش کی، لیکن کچھ خواب ہمیشہ ادھورے رہ جاتے ہیں۔ میں بھی اگلی صبح جانے کس خواب کی نیلگوں واوی میں بھٹک رہا تھا کہ اچانک میرے خوابوں کے ریزہ گر کی آواز گونجی ”آیاں کے بچے چلو اٹھو..... ابا نیچے بلارہے ہیں تمہیں.....“ میں نے چندھیائی ہوئی آنکھوں سے دیکھا۔ ریحان کسی منکر نکیر کی طرح میرے سر پر کھڑا میرا کاندھا ہلا کر مجھے جگا رہا تھا۔ ”کیا مصیبت ہے..... چھٹی کے دن بھی ٹھیک سے نیند پوری نہ کرنے دینا کبھی.....“

”تم نیچے چلو..... ابا ساری نیندیں پوری کروائیں گے تمہاری.....“

میں نیچے اترا تو اباحن میں یوں بے چینی سے ٹہل رہے تھے جیسے میرا بی اے کا نتیجہ اعلان ہونے سے پہلے ہی ظاہر ہو گیا ہو۔ مجھے دیکھ کر ان کی تیوری چڑھ گئی ”یہ وقت ہے تمہارے جاگنے کا۔ دوپہر ہونے کو ہے“ میں چپ رہا۔ ابا نے میرے جواب کا انتظار نہیں کیا ”تمہارے پرچے ختم ہو گئے ہیں۔ اب آگے کیا ارادہ ہے.....؟“

”جی نتیجہ آجائے..... تو پھر کچھ سوچوں گا.....“ وہ تیزی سے میری جانب مڑے۔

”کیا مطلب..... کیا نتیجہ آنے تک اگلے تین ماہ یونہی سارا دن چارپائی توڑتے رہو گئے.....؟..... جانتے ہو جب میں تمہاری عمر کا تھا تو میں صبح چار بجے اٹھ کر پہلے اخبار بانٹتا تھا اور پھر صبح سے شام تک تین ٹیوشنز پڑھانے جاتا تھا۔ چھٹیاں بھی کبھی ضائع نہیں کی تھیں میں نے.....“ میں نے بے زاری سے ایک لمبی سانس بھری اور برآمدے میں پریشان سی بیٹھیں امی کی طرف مدد طلب نظروں سے دیکھا کہ وہ مجھے اگلے دو گھنٹے کے بے زار کن لیکچر سے بچائیں۔ لیکن آج وہ بھی بے بس سی نظر آ رہی تھیں۔ آخر پو نے گھنٹے کے نصیحت آمیز ”خطاب“ کے بعد ابانے حکم صادر کر دیا کہ چونکہ ریحان نوکری کی تلاش میں صبح سے شام کرتا ہے لہذا گھر کے خرچے میں ہاتھ پٹانے کے لیے مجھے بھی کچھ نہ کچھ کرنا ہوگا، لیکن معصیت تو یہ تھی کہ میں نے آج تک کوئی کام کیا ہی نہیں تھا۔ بہر حال امی اور رافعہ کے اشاروں پر میں خاموش کھڑا رہا۔ مغل اعظم فرمان شنانے کے بعد گھر سے نکل گئے لیکن مجھے ایک نئی آزمائش میں ڈال گئے۔

میری نیند اڑ چکی تھی اور مجھے فوری طور پر اپنی تین کی کاہینہ سے مشورے کے لیے کینے فراق پہنچنا پڑا، لیکن وہاں بھی ریسٹوران کا خالی ہال میرا منتظر تھا۔ تب مجھے یاد آیا کہ میں نے خود ہی تو سب دوستوں کو اپنی نیند میں مداخلت نہ کرنے کا حکم دیا تھا۔ مجھے سوچوں میں گم بیٹھا دیکھ کر چچا فراق میری میز کی جانب چلے آئے۔ ”آج وہ باقی تین لفنگے نظر نہیں آرہے۔ اور میاں..... پورے پونے چار سو کا ادھار چڑھ چکا ہے کھاتے میں..... پیسے کب دو گئے؟“ میں نے دکھی نظروں سے چچا کو دیکھا ”ایک تو میں پہلے ہی ابا کی وجہ سے اتنا پریشان ہوں اوپر سے آپ بھی میرا جی جلا رہے ہیں۔“ میری ردنی شکل دیکھ کر چچا فراق حسب معمول اپنا سارا ادھار بھول گئے۔ ”کیا ہوا..... کیا پھر تو قیر احمد نے تمہیں ڈانٹا ہے..... بھی دنیا بدل گئی لیکن ان کی ہیڈ ماسٹری نہ گئی۔ اچھا چلو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں..... گر مگر مچ چائے پیو..... اور میں تمہارے لیے فریش کریم ردل بھجواتا ہوں.....“ ایسے ہی تھے ہمارے چچا فراق باہر سے پتھر اور اندر سے ریشم..... بالکل کسی اخروٹ کی طرح۔ کچھ ہی دیر میں میں وہیں بیٹھا چائے اور



فریش رول کے ساتھ اپنا غم غلط کر رہا تھا کہ اچانک باہر..... کچھ ہنگامے کی آوازیں ابھریں۔ میں نے کھڑکی سے باہر نظر دوڑائی تو کیفے کے فٹشی مرزا کو تین ہٹے کئے مشنڈے لڑکوں کے ساتھ الجھتے پایا۔ میں لپک کر باہر نکلا تو سب سے آگے والا لڑکا مرزا کے گریبان پر ہاتھ ڈال چکا تھا۔ میں نے ایک جھٹکے سے مرزا کا گریبان چھڑا لیا اور مرزا سے پوچھا ”یہ کیا چاہتے ہیں مرزا.....؟“ لیکن مرزا بے چارے کی حالت ایسی تھی کہ اس وقت وہ صرف ہوں ہاں کر کے ہی رہ گیا، لیکن لڑکوں کا سرغنہ شاید ایسی مداخلت کا عادی نہیں تھا۔ وہ غصے سے لال پیلا ہو کر فرمایا ”اپنے کام سے کام رکھو..... ورنہ تمہاری بھی ہڈی پبلی ایک کر دیں گے.....“ میں نے کچھ جواب دیے بنا مرزا کو ایک ہاتھ سے دھکیل کر پیچھے کر دیا اور خود اس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ ”ٹھیک ہے..... تو پھر پہلے مجھ سے ہی نبٹ لو..... اس کے بعد وقت بچے تو مرزا کی ہڈیاں بھی گن لینا.....“ ان تینوں کے چہرے زخم کھائے ساڈ کی طرح تن گئے۔ سرغنہ نے میری جانب قدم بڑھایا لیکن تھم ہی نہ جانے کس طرف سے چچا فراق ہانپتے کانپتے ہمارے درمیان آکھڑے ہوئے۔ ان کے ہاتھ میں پانچ سو کے تین نوٹ تھے جو انہوں نے سرغنہ کی جیب میں ڈال دیے اور لڑکے سے بولے

”معاف کرنا شوکت بیٹا۔ ذرا دیر ہو گئی..... دراصل میں تمہارے ہی کام سے ساتھ والے دوکاندار کے پاس گیا تھا۔ چلو اب غصہ تھوک دو۔ آئندہ دیر نہیں ہوگی.....“ لیکن شوکت نامی سرغنہ کی آنکھوں سے اب بھی شعلے نکل رہے تھے۔ ”یہ خدا کی خدمت گار کون ہے بچا..... کیا تم نے اسے بتایا نہیں کہ یہاں کس کی حکومت چلتی ہے۔“ چچا فراق نے معاملہ رفع دفع کرنے کی کوشش کی۔ ”جانے دو شوکت بیٹا..... یہ بھی اپنا ہی بچہ ہے..... اسے ان معاملات کی خبر نہیں ہے..... میں اسے سمجھا دوں گا“ شوکت کی قہر برساتی نظریں اب بھی مجھ پر ہی گڑی ہوئی تھیں ”تم ہی سمجھا دو تو اچھا ہے..... اور جتنی جلدی سمجھ جائے اتنا ہی بہتر ہے..... ورنہ میں نے سمجھا یا تو.....“ اتنے میں شوکت کے پیچھے کھڑے لڑکوں میں سے ایک بولا ”جلدی کر شوکی..... ابھی بڑی وصولی باقی پڑی ہے۔“ شوکت نے آخری بار نظر بھر کے مجھ سے دیکھا اور زیر لب کچھ بڑبڑاتے ہوئے وہاں سے آگے بڑھ گیا۔ اس تمام عرصے میں چچا فراق نے میرا دایاں بازو تختی سے جکڑ کر پکڑے رکھا تھا جیسے انہیں خدشہ ہو کہ میں جذبات میں کچھ کر نہ بیٹھوں۔ ان کے جانے کے بعد میں مرزا کی طرف پلٹا۔ ”یہ کیا ماجرا تھا.....؟..... اور یہ لوگ اس طرح دھمکا کیوں رہے تھے جیسے کوئی پرانا ادھار باقی ہوا ان لوگوں کا.....“

چچا نے بات مائی ”آیاں بیٹا تم ان باتوں میں نہ پڑو۔ ہے کوئی پرانا حساب کتاب ان لوگوں کا..... ایسے لوگوں کے آڑے نہیں آیا کرتے۔ ہاں بھی مرزا..... تم ذرا میرے ساتھ چلو..... کچھ ضروری حساب کرنا ہے۔ پچھلے ماہ کا.....“

صاف لگ رہا تھا کہ وہ مرزا کو بھی کسی بہانے وہاں سے لے جانا چاہتے ہیں تاکہ میں اسے نہ کرید سکوں۔ ان دونوں کے جانے کے کچھ دیر بعد ہی رعبہ پارٹی آچکی۔ میں نے کچھ دیر پہلے کا سارا واقعہ انہیں تفصیل کے ساتھ بتایا تو وہ تینوں بھی سوچ میں پڑ گئے۔ ٹھیک اسی وقت سڑک پر وہی تین لڑکے پرانی سی ویلیز جیب میں تیزی سے سکرینچ لگاتے ہوئے گزر گئے۔ میں نے ان کی طرف اشارہ کیا ”یہی تین سورتھے وہ.....“ بالا ایسے موقعوں پر زیادہ جذباتی ہو جاتا تھا۔ ”چلو انو..... ان کا پتہ لگاتے ہیں..... ان کی تو.....“ میں نے ہاتھ پکڑ کر اسے بٹھا دیا۔ ”ان کا بھی پتہ چل جائے گا۔ پہلے مرزا کو گھیرنا ہوگا کیلے میں..... کیونکہ چچا فراق کے سامنے وہ کچھ نہیں بتائے گا.....“ اور پھر ٹھیک کیفے بند ہونے کے وقت پر ہم چاروں کاؤنٹر کے سامنے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے کھڑے تھے۔ پیسے گنتے ہوئے مرزا نے ہم چاروں کو یوں ساکت کھڑے دیکھا تو وہ گھبرا سا گیا ”کیوں

بھئی..... کیا ارادے ہیں.....؟.....“ فشی نے اپنی آواز گھمبیر بناتے ہوئے اسے دھمکایا۔ ”آج کی جتنی بھی کمائی ہے..... نکال کر سامنے کاؤنٹر پر رکھ دو.....“ مرزا گھگھایا۔ ”کیوں مذاق کرتے ہو۔ میرا دل دیسے ہی بڑا کمزور ہے.....“ راجہ بولا۔ ”ٹھیک ہے تو پھر آج جن لڑکوں کو چچانے پیسے دیے تھے۔ ان کا سارا کچا چھٹا دو رو نہ آج سے ہم بھی پیسے جمع کرنے کا وہی طریقہ آزمائیں گے.....“ مرزا ان لڑکوں کا ذکر سن کر بدحواس سا ہو گیا اور اس نے جلدی میں دائیں بائیں نظر دوڑائی۔ میں نے اسے اطمینان دلایا۔ ”فکر نہ کرو..... فراق چچا گھر جا چکے ہیں.....“ مرزا اب بھی خوف زدہ سا تھا۔ ”لیکن اگر مالک کو پتہ چلا کہ میں نے.....“

”فکر نہ کرو..... انہیں کچھ پتہ نہیں چلے گا.....“ مرزا نے جلدی جلدی بڑے چھوٹے نوٹ الگ کر کے ان پر بڑبینڈ چڑھایا اور تجوری میں رکھ کر ہماری جانب پلٹا۔ اس کی آواز اب بھی سرگوشی نہ تھی۔

”وہ تینوں رنگ بھائی کے آدمی تھے۔ ہفتہ اکٹھا کرنے آئے تھے۔“ راجہ نے حیرت سے اسے دیکھا۔ ”رنگ بھائی..... یہ رنگ کون ہے مرزا جی۔“ مرزا نے جلدی سے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھی۔ ”شش..... آہستہ بولو..... دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔ تم لوگ رنگ کو نہیں جانتے..... سارنگا عرف رنگ بھائی۔ اس پورے علاقے کا ان داتا ہے وہ..... اس کی مرضی کے بغیر چڑیا بھی پر نہیں مار سکتی اس ایریا میں.....“

”کیوں..... وہ اس علاقے کا وزیر ہے کیا..... اور پہلے تو کبھی اس کا نام نہیں سنا ہے ہم نے.....“

”ارے میاں وزیر خود رنگ بھائی کے گھر کا پانی بھرتے ہیں..... اور پہلے وہ یہاں ہوتا ہی کب تھا جو تم اس کا نام سنتے..... رنگا ایسے چھوٹے شہروں کی بادشاہت قبول نہیں کرتا۔ جانے کیا بات ہے جو اس مرتبہ وہ یہاں آکر ٹک گیا ہے۔“ ہم سب حیرت سے مرزا کی طرف دیکھ رہے تھے جو سارنگا کا تعارف یوں کروا رہا تھا جیسے وہ کوئی دیوالائی کردار ہو مجھ سے رہا نہیں گیا۔ ”لیکن اگر وہ ایسا ہی کوئی لاٹ صاحب ہے تو اس کے کارندے گلی گلی دوکان دوکان یہ چندہ کیوں اکٹھا کرتے پھرتے ہیں.....؟“ مرزا نے اپنا سر کھجایا۔ ”اب یہ تو اللہ ہی بہتر جانے..... اور پھر کسے پتہ کہ یہ ہفتہ وصولی سارنگا کے ہی حکم سے ہوتی ہو یا پھر یہ لونڈے لپاڑے اس کے نام پر یہ بد معاشی کرتے ہوں بہر حال..... ایک بات تو طے ہے کہ جو بھی یہ ہفتہ دیتا ہے پھر علاقے کے باقی تمام غنڈوں، چوراچکوں بشمول پولیس..... کوئی بھی ہفتہ دینے والے دوکاندار پر بری نظر نہیں ڈال سکتا..... پھر وہ بندہ سارنگا کی ذمہ داری بن جاتا ہے.....“ راجہ جو بہت دیر سے یہ ساری کہانی برداشت کر رہا تھا بے زار ہو کر بولا۔ ”مجھے تو یہ سب کسی انتہائی پٹی ہوئی اور بوگس فلم کا پاٹ لگتا ہے۔ یہ رابن Robin Hood ٹائپ کردار آج کل کہیں نہیں پائے جاتے اور مرزا جی..... تم یہ ہفتہ اگر ہم چاروں کو باقاعدگی سے ادا کرو تو آج سے کیسے فراق اور تمہاری جان کی ذمہ داری ہماری..... کسی کی کیا مجال جو اس کیسے کی طرف آنکھ بھی اٹھا کر دیکھ سکے.....“

مرزا نے کانوں کو ہاتھ لگائے۔ ”تم لوگوں کو مذاق سوچ رہا ہے اور میں نے خود اپنی آنکھوں سے یہ بھتہ نہ دینے والوں کے گھر اور کاروبار تباہ ہوتے دیکھے ہیں۔ خدا کے لیے اس ساری بات کا ذکر مالک سے ہرگز نہ کرنا۔ ورنہ میری خیر نہیں.....“

مرزا ہمیں گہری سوچ میں گم چھوڑ کر آگے بڑھ گیا۔ شہر کی بنیاں بچھ چلی تھیں اور صرف سڑکوں کے کنارے لگی زرد تیلیوں کی روشنی آس پاس پھیلی ہوئی تھی۔ اس وقت ہم چاروں کے ذہن میں ایک ہی بات گردش کر رہی تھی لیکن ہم چاروں میں سے کوئی بھی یہ نہیں جانتا تھا کہ یہی ایک بات

ہماری زندگیوں کا رخ پلٹنے والی تھی۔

اگلی صبح راجہ میرے جاگنے سے پہلے ہی گلی میں موجود تھا۔ میں نے اسے چھت سے وہیں اوپر آنے کا اشارہ کیا۔ راجہ ساری معلومات لے کر آیا تھا۔ بھتہ لینے والے لڑکے ہر جمعرات کو ہمارے محلے کے اطراف اسی پرانے ماڈل کی ویلیز جیپ میں آتے تھے۔

ہم فیصلہ کر چکے تھے کہ اگلے ہفتے ہمیں کیا کرنا ہے۔ میں اور راجہ سر جوڑے اپنی منصوبہ بندی میں اس قدر کھوئے ہوئے تھے کہ ہمیں ریحان کے چھت پر آنے کی خبر ہی نہیں ہوئی۔ اس نے ہمیں یوں سرگوشیاں کرتے دیکھا تو مشکوک سا ہو گیا۔ ”یہ تم دونوں کون سے منصوبے کی کڑیاں جوڑ رہے ہو..... آیان خدا کے لیے اب مزید کوئی کارنامہ نہ کر بیٹھنا۔ ابا پہلے ہی تم سے بہت ناراض ہیں..... اس بار وہ تمہاری کوئی غلطی معاف نہیں کریں گے.....“ میں نے ریحان کی بات حسب معمول ہوا میں اڑادی..... ”اچھا اچھا..... ٹھیک ہے..... اب تم میرے ابا غانی بننے کی کوشش نہ کرو۔ مجھے پتہ ہے کہ کیا ٹھیک ہے اور کیا غلط.....“ اتنے میں نیچے گلی میں بالے کی پھٹ پھٹی کا سائیکسز گونجا اور میں اور راجہ ریحان کے منع کرنے کے باوجود چھت سے ملحق گلی میں اترتے پائپ سے لٹکتے ہوئے گلی میں کود گئے۔ یہ ہمارا خاص شارٹ کٹ تھا۔ بالے اور مٹی نے بھی اپنا کام نبھالیا تھا۔ بالے نے خبر دی ”سب پتہ چل گیا ہے..... وہ ہفتہ لینے کی ابتداء سادات محلے کی چوڑی گلی سے کرتے ہیں..... کل سترہ دوکاندار بھتہ دیتے ہیں انہیں وہاں.....“

”ٹھیک ہے..... تو پھر ہمیں ایک مرتبہ سادات محلے کی چوڑی گلی کے آس پاس کے علاقے کا جائزہ بغور لینا ہوگا تا کہ ہم یہ فیصلہ کر سکیں کہ ان سورماؤں کو کہاں روکنا ہے۔“ میری بات پر سبھی نے سر ہلائے اور کچھ دیر بعد ہی ہم سادات محلے کی چوڑی گلی سے منسلک گلیوں کے چکر کاٹ رہے تھے۔ تیسری گلی جہاں بھتہ دینے والا صرف ایک دوکاندار تھا، نسبتاً کچھ سنسان تھی۔ ہم نے سارنگا کے غنڈوں کو روکنے کے لیے یہی گلی منتخب کر لی۔ ابھی ہم دیگر جزئیات طے کر رہی رہے تھے کہ اچانک میرے کان دھڑے پر کسی کے ہاتھ کا نرم دباؤ محسوس ہوا۔ ”واہ آیان صاحب..... بڑی راہ دکھائی آپ نے..... لگتا ہے وعدہ کر کے بھول گئے.....“ میں چونک کر پلٹا۔ میرے سامنے تنویر کا مسکراتا چہرہ تھا۔ ”ماموں روزانہ آپ کا انتظار کرتے ہیں..... لگتا ہے آپ نے ہماری خطا ابھی تک معاف نہیں کی.....“

”نہیں نہیں..... ایسی کوئی بات نہیں..... بس امتحانات کی مصروفیت میں الجھے رہے ہم سب۔“

”ٹھیک ہے اگر ایسی بات ہے تو آپ ابھی اسی وقت میرے ساتھ گھر چلیں ماموں کو پتہ چلا کہ آپ سادات محلے تک آ کر واپس لوٹ گئے ہیں تو وہ مجھ سے بہت ناراض ہوں گے.....“ میں نے تنویر کو ٹانے کی بہت کوشش کی لیکن لگتا تھا وہ مجھے ساتھ لے جائے بنا نہیں جائے گا۔ میں نے اپنے دوستوں کو اشارتاً اپنا کام جاری رکھنے کا کہا اور خود تنویر کے ساتھ چل پڑا۔ تنویر مجھے چند لمحوں کے لیے دروازے کے باہر انتظار کرنے کا کہہ کر گھر کے اندر گیا اور دوسرے ہی لمحے شیخ صاحب لپکتے چھپکتے دروازے سے برآمد ہوئے اور گلے شکوے کرتے ہوئے میرا ہاتھ پکڑ کر گھر کے اندر لے گئے۔ کچے محن والا چھوٹا سا صاف ستھرا کوارٹر تھا۔ جس میں چاروں جانب پھولوں کی کیاریاں بنی ہوئی تھیں جن میں سرخ، پیلی اور سفید گلاب خوبصورتی سے ترشی ہوئی باڑھ میں ٹٹکے ہوئے تھے۔ برآمدے کو بزرنگ کی جافری سے بند کیا گیا تھا۔ شیخ صاحب مجھے نفاس سے بچی ایک چھوٹی سے بیٹھک میں لے آئے۔ ”کیا میاں..... لگتا ہے تم بھول گئے شیخ کبیر کو.....“ شیخ صاحب کافی دیر اپنے دکھڑے سناتے رہے۔ انہی کی زبانی مجھے پتہ چلا کہ وہ



اپنے اکلوتے بیٹے حمید کو نور پور اپنی بچی کبھی متاع کے حساب کتاب کے لیے چھوڑ آئے تھے۔ یہاں وہ اپنی گھر والی اور دونوں بیٹیوں کے ساتھ آئے تھے۔ چھوٹی بیٹی گہنا کا نام تو میں سن چکا تھا۔ البتہ بڑی کا ذکر کرتے ہوئے شیخ صاحب کی آواز کچھ بھرا سی گئی ”بڑی کا نام ستارہ ہے میاں۔۔۔۔۔ لیکن نصیب کے معاملے میں اس کا تارہ بہت سیاہ نکلا۔ شادی کے تیسرے ماہ ہی شوہر ایک حادثے میں چل بسا، اور گزشتہ ڈیڑھ سال سے وہ ایک بیوہ کی زندگی گزار رہی ہے۔ خدا کسی کی بیٹی کو کبھی بیوہ نہ کرے۔“ ماحول سوگوار سا ہو گیا۔ شیخ صاحب مجھ سے معذرت کر کے کمرے سے باہر نکل گئے۔ تنویر شاید پہلے ہی چائے کے لوازمات وغیرہ کے سلسلے میں زنانے میں ہاتھ بٹا رہا تھا۔ مجھے وہاں سے نکلنے کی جلدی تھی کیونکہ باہر میرے دوست میری راہ تک رہے تھے۔ اچانک درمیانی دروازے کی جانب سے کچھ آہٹ بلند ہوئی، اور کسی کی شرارت بھری کھٹکتی آواز گونجی۔

”اوہ۔۔۔۔۔ تو وہ والے آیاں صاحب تشریف لائے ہیں۔۔۔۔۔ جو قلی نہیں ہیں۔۔۔۔۔“

میں چونک کر پلٹا۔



## کتاب گھر کا پیغام

ادارہ کتاب گھر اردو زبان کی ترقی و ترویج، اردو مصنفین کی موثر پہچان، اور اردو قارئین کے لیے بہترین اور دلچسپ کتب فراہم کرنے کے لیے کام کر رہا ہے۔ اگر آپ سمجھتے ہیں کہ ہم اچھا کام کر رہے ہیں تو اس میں حصہ لیجئے۔ ہمیں آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔ کتاب گھر کو مدد دینے کے لیے آپ:

- ۱۔ <http://kitaabghar.com> کا نام اپنے دوست احباب تک پہنچائیے۔
- ۲۔ اگر آپ کے پاس کسی اچھے ناول/کتاب کی کمپوزنگ (ان پیج فائل) موجود ہے تو اسے دوسروں سے شیئر کرنے کے لیے کتاب گھر کو دیجئے۔
- ۳۔ کتاب گھر پر لگائے گئے اشتہارات کے ذریعے ہمارے سانسرز کو وزٹ کریں۔ ایک دن میں آپ کی صرف ایک وزٹ ہماری مدد کے لیے کافی ہے۔

## باب 4

دروازے پر پڑے پردے کی آڑ میں ضرور چھوٹی والی گہنا ہی تھی۔ کیونکہ بڑی والی کی تو میں نے کبھی آواز تک نکلتے نہ سنی تھی۔ میرے منہ سے بے اختیار نکلا ”جی..... فرمائیے..... مزید کچھ سامان ڈھونڈتا ہوں تو میں حاضر ہوں.....“ دوسری جانب سے بے اختیار دبی دبی ہنسی کی آواز ابھری۔

”نہیں..... فی الحال تو ایسی کوئی ضرورت نہیں..... البتہ جب کبھی مزدوری کا کچھ کام آن پڑا تو آپ کو زحمت ضرور دیں گے.....“

پردے کے پیچھے مزید کچھ کھسر پھسر ہوئی جیسے کوئی اور بھی وہاں موجود ہو اور وہ گہنا کو دبی آواز میں سرزنش کر رہا ہو۔ پھر گہنا کی ہی آواز آئی۔

”آپنی آپ سے کچھ کہنا چاہتی ہیں.....“

گویا گہنا سے بڑی ستارہ بھی وہیں موجود تھی۔ چند لمحے سکوت کے گزرے اور پھر قدرے گھبرائی سی آواز سنائی دی۔

”ہم سب آپ سے اس روز کے رویے کی معذرت چاہتے ہیں..... گہنا کی زبان کو لگام نہیں ہے۔ ابا کے لاڈ پیار نے اسے بگاڑ دیا ہے، لیکن امی گہنا کی اس رات کی حرکت پر بہت ناام ہیں.....“

”آپ لوگ خواہ مخواہ ہی پریشان ہو رہے ہیں۔ وہ بات تو اسی رات ختم ہو گئی تھی۔ رہی بات گہنا کی تو میں ایسی ”نادان بچیوں“ کی بات کا برا نہیں منایا کرتا۔ اپنی امی سے کہیں دل پر بوجھ نہ لیں۔“

میری ”نادان بچی“ والی اصطلاح پر اندر شاید گہنا پر کچھ چوٹ ہو گئی، تبھی وہ ایک دم بولی ”میں نادان بچی نہیں ہوں..... تھرڈ ایئر میں پڑھتی ہوں..... سمجھے آپ..... اور مجھے بالکل پسند نہیں کہ ابایا کوئی اور مجھے نادان بچی کہے.....“ میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ حیرنشانے پر لگا تھا۔

اتنے میں بیرونی دروازے پر برتنوں کی آہٹ ہوئی اور شیخ صاحب تنویر کے ساتھ چائے کی ٹرے اور کیک، بسکٹ وغیرہ لیے اندر داخل ہوئے۔ درمیانی کمرے کے پردے کے پیچھے خاموشی چھا گئی۔ چائے کے دوران شیخ صاحب کے دل میں چھپا سوال زبان پر آ ہی گیا۔

”آیاں بیٹا..... ایک بات کی سمجھ نہیں آئی..... تمہارا اپنا گھر خدا کے فضل سے قائم و سلامت ہے..... تو پھر اس رات تم وہاں اس ہوٹل کے باہر برستی بارش میں فنٹ پاتھ پر کیوں سو رہے تھے؟“

”اس لیے کہ میرے ابا نے اس رات مجھے گھر بدر ہونے کا حکم دے دیا تھا.....“ شیخ صاحب شاید ایسے کسی جواب کی توقع نہیں کر رہے تھے لہذا اچھل ہی پڑے ”کیا مطلب.....؟..... یعنی کہ..... لیکن کیوں.....؟..... بھی تم تو بڑے فرمانبردار بچے ہو.....“

”شکریہ..... لیکن میرے ابا کے خیالات آپ سے کافی مختلف ہیں.....“ میں نے بنا کچھ چھپائے تفصیل سے شیخ صاحب کو اس رات کی تمام روداد بتادی۔ تنویر اور شیخ کبیر حیرت سے سنتے رہے۔ پھر شیخ صاحب نے ہی بات جوڑی۔ ”مجھے تمہاری صاف گوئی بہت اچھی لگی۔ ماں باپ کا اپنی اولاد کے لیے فکر مند ہونا بھی ایک معمول کی بات ہے۔ مجھے امید ہے کہ جب تم کسی مقام پر پہنچ کر دکھاؤ گے تو تمہارے یہی ابا فخر سے لوگوں کو

تمہارے بارے میں بتایا کریں گے۔“ تنویر نے مجھے بتایا کہ وہ مقامی ہائی سکول میں تاریخ اور جغرافیہ پڑھاتا ہے اور شام کو بچوں کو ٹیوشن بھی دیتا ہے۔ اس نے مجھے بھی پیش کش کی کہ اگر میں کچھ پیسے کمانا چاہوں تو وہ میرے لیے کوئی ٹیوشن ڈھونڈ سکتا ہے۔ بلکہ اسے ان دنوں بھی اپنے کسی جاننے والے کی خواہش پر کوئی استاد درکار تھا۔ میں نے تنویر کو بتایا کہ میری پڑھائی لکھائی سے کچھ خاص بھی نہیں ہاں البتہ اگر اردو کے لیے کوئی ٹیوشن درکار ہو تو شاید میں پڑھاسکوں۔

میری بات سن کر تنویر کا چہرہ کھل اٹھا۔ ”بہت خوب..... پھر تو سمجھو کام بن گیا۔ بارہویں جماعت کی ایک طالبہ کے لیے اردو کا استاد درکار ہے۔ مہینے کے دور ہزار ملیں گے۔ شاید کچھ زیادہ بھی ملے ہو جائیں لیکن شرط یہ ہے کہ آپ کو اس طالبہ کے گھر جانا ہوگا۔ سواری کا انتظام بھی وہ لوگ خود ہی کریں گے۔“ مجھے اپنے ابا کی آخری وارننگ یاد آئی اور میں نے ہائی بھری۔ تنویر نے وعدہ کیا کہ وہ اگلے روز ہی میری ٹیوشن چکی کروادے گا۔ مجھے اپنے چوبیس گھنٹوں میں سے ایک گھنٹے کی قربانی دینا تھی، لیکن مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے مجھے عمر قید کی سزا سنائی جا رہی ہو۔ پابندی بھی تو ایک قید ہی ہوتی ہے بلکہ شاید خود کو پابند کرنا قید سے بھی بڑی قید ہوتی ہے۔ ہماری تمام زندگی کا فلسفہ اور سزا و جزا کا تمام تصور ایک اسی ”پابندی“ کے محور کے گرد ہی تو گھومتا ہے۔

کافی دیر بعد مجھے شیخ صاحب نے صرف اس شرط پر جانے کی اجازت دی کہ میں اب ان کے ہاں آتا جاتا رہوں گا۔ میں رخصت ہونے کے لیے کھڑا ہوا تو درمیانی کمرے کے پردے کے پیچھے سے کسی خاتون کے کھانسنے کی آواز سنائی دی۔ شیخ صاحب بے تکلفی سے بولے ”آجائیں شیفانی جی..... آجائیں بھی تنویر کی طرح اپنا ہی بچہ ہے۔“ پردے کے پیچھے سے شیخ صاحب کی گھر والی برآمد ہوئیں۔ آج وہ صرف ایک بڑی سی چادر سے خود کو ڈھانپے ہوئے تھیں۔ انہوں نے میرے سلام کے جواب میں آگے بڑھ کر میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور دعائیں دیں اور چلتے وقت خواہش ظاہر کی کہ وہ اور ان کی بچیاں اس نئے ماحول میں کسی اپنے اور شناسا چہرے کی رفاقت کے بغیر اداس سے ہو گئے ہیں لہذا میں اپنے گھر کی خواتین کو لے کر ضرور ان کے ہاں آؤں۔ میں نے انہیں امی اور چھوٹی رافہہ کے بارے میں بتایا اور انہیں بھی اپنے ہاں آنے کی دعوت دی۔

جب میں شیخ صاحب کے گھر سے باہر نکلا تو وہ تینوں اسی گلی کی نکل پر میرا انتظار کر رہے تھے۔ راجہ سے رہا نہ گیا ”خیر تو تھی..... بڑی دیر لگا دی ہم تو سمجھے تھے کہ شیخ صاحب نے تمہیں گھر دامادی ہی سوچ دی ہے۔“

”بکومت..... یہ بتاؤ سارا آگایچھا دیکھ لیا ہے.....؟“

”ہاں..... چاروں اطراف کا جائزہ لے لیا ہے ہم نے..... لیکن یارانو..... ہم سب نے فیصلہ کیا ہے کہ تم ان کے سامنے نہیں آؤ گے۔ کیونکہ وہ تمہیں پہلے دیکھ چکے ہیں اور ہم اپنے محلے سے اتنی دور انہیں اسی لیے روک رہے ہیں کہ وہ اس معاملے کا کوئی بھی سرا کیسے فراق سے نہ جوڑ سکیں۔ بلکہ ہم تینوں بھی چہرے چھپا کر ان کا راستہ روکیں گے۔“

مشی لڑائی جھگڑے سے ذرہ کتر اٹھا تھا۔ اس کے چہرے پر اب بھی پریشانی کے آثار تھے ”لیکن یار کیا انہیں بہتہ لینے سے روکنے کے لیے یہ سب کرنا ضروری ہے..... ہم لوگ ویسے ہی ان سے جا کر بات کیوں نہیں کر لیتے.....“



”دھت تیرے کی.....“ راجہ نے اس کے سر پر ایک چپت رسید کی۔

”اور تم کیا سمجھتے ہو کہ ہماری اس درخواست پر کہ جناب عالی براہ مہربانی آپ ہمارے علاقے سے آئندہ اگر بہت اکٹھا نہ کریں تو بڑی مہربانی ہوگی..... وہ مسکرا کر کہیں گے کہ عالی حضور..... آپ لوگوں نے تو ہماری آنکھیں کھول دیں..... آج کے بعد اگر ہم آپ کے علاقے میں قدم دھریں تو جو چور کی سزا وہ ہماری.....“ مجھے راجہ کے انداز پر ہنسی آگئی۔ بالے نے بڑے بزرگوں کی طرح مٹی کو سمجھایا۔

”مٹی بیٹا..... وہ چھنے ہوئے غنڈے ہیں..... بات بے بات چاقو چلا دینے والے..... ان سے ہمیں ان کی زبان میں ہی بات کرنا ہوگی..... اگر تمہیں ڈر لگ رہا ہے تو اس روز تم آرام سے گھر میں بیٹھ کر اپنی امی کے ہاتھ کی بنا کی بریانی کھانا اور ہمیں یاد کرنا.....“ مٹی کی امی بریانی بہت اچھی بناتی تھیں لیکن مٹی کی یہی کمزوری اس کی چڑ بھی تھی۔ وہ بھنا کر بولا ”ڈرتی ہے میری جوتی..... جو ہوگا دیکھا جائے گا.....“ بالے اور راجہ نے نظر بچا کر مسکراتے ہوئے ایک دوسرے کو آنکھ ماری۔ ان کا مقصد مل ہو چکا تھا۔

میں گھر پہنچا تو امی اور رافعہ، ریحان سمیت صحن میں ہی بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ امی نے مجھے ڈانٹا۔ ”انو..... تو یہ سارا دن گھر سے باہر کہاں بھٹکتا پھرتا ہے..... کبھی دو گھڑی ماں کے ساتھ بھی بیٹھ جایا کر..... جا رافعہ..... بھائی کے لیے گرم چائے لے آ.....“ میں نے ریحان سے پرانا بدلہ چکایا ”امی..... آپ کے پاس آپ کی یہ بڑی بیٹی ریحانہ جو ہر وقت موجود رہتی ہے..... ایسے میں بھلا آپ کو آیاں کی کیا ضرورت.....“ امی مسکرائیں۔ ریحان کو غصہ آگیا۔ ”ہاں ہاں بیٹا..... اڑالو مذاق..... کم از کم گھر میں رہ کر ابا کا گھر کے کسی کام میں ہاتھ تو بٹاتا ہوں ناں..... تمہاری طرح تو نہیں ہوں..... گھر کا نہ گھاٹ کا.....“

”فکر نہ کرو ریحان میاں..... اب تمہارے اس طعنے کا بھی تو ذکر کر لیا ہے ہم نے..... آیاں احمد کو ایک ٹیوشن مل گئی ہے..... مبلغ دو ہزار روپے کی..... کبھی کتاب و کتاب خریدنے کے لیے پیسے ویسے چاہئے ہوں تو مانگ لینا..... آیاں منکسوں کو منع نہیں کیا کرتا..... اب بولو..... کون ہو گا گھر کا نہ گھاٹ کا.....“ امی خوشی کے مارے کھڑی ہو گئیں۔ ”سچ..... انو سچ بتا..... کہیں تو بڑے بھائی کے ساتھ دل لگی تو نہیں کر رہا.....“ رافعہ کے ہاتھ میں بھی گرم چائے کا کپ چھلک سا گیا۔

”سچ بھائی..... آپ ٹیوشن پڑھانے جایا کریں گے..... واہ..... کتنا اچھا لگے گا ابا کو یہ سن کر.....“

ریحان کو ابھی تک یقین نہیں آ رہا تھا۔ ”ٹیوشن..... لیکن کہاں..... اور مضمون کیا ہوگا ٹیوشن کا.....“ میں نے گول مول لفظوں میں بتایا کہ میرے کوئی جاننے والے ہیں جنہوں نے اردو ٹیوشن کا بندوبست کر دیا ہے، اور ایک آدھ دن میں باقی تفصیلات بھی طے ہو جائیں گی۔ پل بھر میں گھر کے اندر عید کا سماں ہو گیا۔ ان سب کے لیے یہ خبر کسی عید کے چاند کی نوید سے کم نہیں تھی کہ بقول ابا دنیا جہاں کے ناکارہ آیاں نے بھی آخر کار کوئی کام کرنے کی ہامی بھری لی تھی۔ امی کو فوراً فکر لگ گئی کہ ان کا ہونہار سپوت کل کون سے کپڑے پہن کر ٹیوشن پڑھانے جائے گا۔ انہوں نے فوراً! چھوٹی کو میرے سبھی کرتے استری کرنے کا حکم دے دیا۔ ریحان میری بڑھی ہوئی شیدو دیکھ کر چلایا ”خدا کے لیے اب تو اپنی یہ حالت سدھار لو۔ چھوٹی جلدی سے بھاگ کر میری دراز سے نیاریز اور شیدو گ کریم لے آؤ۔ آج ہم سب مل کر اس کی شیدو کریں گے..... ایسے تو یہ مانے گا نہیں.....“ وہ آفت کی

پر کالہ بھی جیسے ریحان کی طرف سے اشارے کی منتظر تھی۔ اگلے ہی لمحے ریحان مجھے جکڑ چکا تھا اور رافضہ اندر سے شیو کا سامان لیے بھاگی چلی آ رہی تھی۔ امی ارے ارے ہی کرتی رہ گئیں اور ان دونوں نے میرا چہرہ جھاگ سے بھر دیا۔ میں چلاتا رہا کہ ہلکی بڑی ہوئی شیو میں میں کچھ زیادہ سنجیدہ استاد لگوں گا پروہاں کوئی میری سنتا تب ناں..... ایک لمحے کے لیے ریحان کی گرفت مجھ پر کم زور ہوئی تو میں زور لگا کر اس کی گرفت سے نکل گیا۔ اب صورت حال یہ تھی کہ چھوٹی ہاتھ میں شیو گنگ گ اور برش اور ریحان ریزر تھا میرے پیچھے پیچھے گول دائرے میں بھاگ رہے تھے اور میں امی کو درمیان میں آڑ بنا کر پورے صحن میں ان سے بچنے کے لیے چکر کاٹ رہا تھا۔ ہم سب چیخ رہے تھے۔ چلا رہے تھے ہنس رہے تھے اور امی اپنی ہنسی چھپا کر ہم سب کو ڈانٹ رہی تھیں۔ اچانک صحن کا دروازہ دھڑ سے کھلا اور دروازے کے پتوں بچ کھڑے ابا کی دھاڑ گونجی ”یہ سب کیا ہڑ بونگ چار کھی ہے تم لوگوں نے.....؟“

ہم سب ابا کی آواز سن کر یوں جامہ ہو گئے جیسے کسی نے ریوٹ کنٹرول سے ساکت کاٹن دبا دیا ہو۔ ابا نے اپنی چھتری بوکھلائی سی امی کے حوالے کی اور پھر گرجے ”گھر کو جڑیا گھر بنا رکھا ہے..... ریحان..... کم از کم تم سے مجھے ایسی امید نہیں تھی.....“ گویا مجھ سے تو ابا نے کبھی کوئی اچھی امید باندھی ہی نہیں تھی۔ چھوٹی نے جلدی سے ابا کی شیر وانی سنبھالی ”ابا پیٹہ ہے آیاں بھیا کو دو ہزار روپے کی ٹیوشن مل گئی ہے.....“ ابا کو شاید زندگی میں پہلی بار میری جانب سے کوئی خوشی کا جھٹکا لگا ”کیا.....؟؟“ امی نے آگے بڑھ کر میرے سر پر ہاتھ پھیرا ”میرا انواب ذمہ دار ہوتا جا رہا ہے.....“ شاید یہ میرا وہم ہی ہو، پر جانے مجھے ایسا کیوں لگا کہ ابا کی آنکھوں میں کچھ نمی سی جھلکائی ہو، اور پھر وہ ہوا جو بچپن کے بعد آج تک کبھی میرے ساتھ نہیں ہوا تھا۔ ابا نے میرے سر پر ہاتھ رکھ کر دعا دی ”جیتے رہو.....“ پھر وہ صحن میں رکے بنا اندر چلے گئے۔ اچھا ہی ہوا اور نہ شاید کچھ ہی دیر میں سب ہی وہاں رو پڑتے اور پھر دوسرے لمحے ہی ان کی اندر کمرے سے جھلائی ہوئی تیز آواز آئی..... ”ارے بھئی..... یہ میرے سلیپر پھر کون پہن گیا..... کتنی بار منع کیا ہے اس مالالائق آیاں کو کہ میرے چپل نہ پہنا کرے.....“ امی، ریحان اور چھوٹی تینوں کی نظریک وقت میرے پیروں کی جانب اٹھی اور میں ابا کے چپل وہیں صحن میں اتار کر ننگے پاؤں چھت کی سیڑھیوں کی طرف دوڑا۔ وہ سب زور سے ہنس پڑے۔ کاش اس وقت خبر ہوتی کہ ان مسکراہٹوں کی عمر اتنی مختصر ہوتی ہے تو میں وقت کو روک دیتا..... لیکن وقت بھلا کسی کے روکے سے کب رکا ہے۔

اگلے روز تنویر سے طے کردہ وقت پر میں کیفے فراق پہنچا تو میری چندال چوکڑی بھی وہیں موجود تھی۔ راجہ نے مجھے دیکھ کر سیٹی بجائی۔ بالے نے اٹھ کر چاروں طرف طواف کر کے مجھے غور سے دیکھا اور مٹی نے شکوہ کیا ”یارانو..... تو نے شادی کر لی اور ہمیں بتایا بھی نہیں.....“ میں نے اسے گھورا ”ہوش میں تو ہو..... میں نے کب شادی کی.....؟“ راجہ نے ہونٹ سکیڑے ”یہ چمپاتی شیو..... یہ لشکارے مارتا نیا کرتہ..... یہ ریحان کی واسک..... ہم تمہیں دولہا نہ کہیں تو کیا کہیں.....“

”بکومت..... مجھے آج ٹیوشن پڑھانے جانا ہے دعا کرو سب ٹھیک رہے..... زندگی میں پہلی مرتبہ آج ابا مجھے ریحان کی طرح رخصت کرنے صحن تک آئے تھے.....“ ان تینوں نے باقاعدہ دعا کے لیے ہاتھ فضا میں بلند کر دیے۔ ٹھیک اسی لمحے ان تینوں کے اٹھے ہوئے ہاتھوں کے پس منظر میں مجھے تنویر کیفے فراق کے مرکزی دروازے سے اندر داخل ہوتا دکھائی دیا۔ سلام دعا کے بعد اس نے بتایا کہ جس گھر میں مجھے ٹیوشن پڑھانے

جانا ہے وہاں کا ڈرائیور مجھے لینے آچکا ہے اور اب روزانہ وہ یہیں کینے فراق سے ٹھیک چار بجے شام مجھے لینے پہنچ جائے گا اور دو گھنٹے کی ٹیوشن کے بعد یہیں چھوڑ جایا کرے گا۔ تو یہ خود کسی کام سے کہیں جانا تھا لہذا مجھے اکیلے ہی یہ سفر طے کرنا تھا۔ میرے تینوں دوستوں نے مجھے یوں رخصت کیا جیسے کسی محاذ پر جا رہا ہوں، اور سچی بات یہ ہے کہ خود میرے لیے یہ سب کچھ کسی محاذ جیسا ہی تھا۔ کیونکہ ہم چاروں میں سے کسی نے آج تک کوئی بھی کام تجاہل شروع نہیں کیا تھا۔

درمیانے ماڈل کی بڑی سی کار کی چاروں کھڑکیوں پر سفید پردے کچھے ہوئے تھے۔ مطلب اس گھر کی خواتین پردہ کرتی تھیں۔ ڈرائیور پکی عمر لیکن مضبوط جسامت کا مالک تھا۔ پوچھنے پر نام اسماعیل بتایا۔ کچھ خاموش سا تھا یا پھر اجنبیوں سے زیادہ بے تکلفی پر پابندی تھی۔ میرے بہت سے سوالوں کے جواب میں اس نے بس اتنا ہی بتایا کہ شہر کے کوئی بہت بڑے بیوپاری ہیں سیٹھ داؤد..... انہی کی صاحبزادی کو پڑھانا ہے۔ دو ہزار روپے تو یہ کار میں بیٹھنے سے پہلے ہی میری جیب میں ڈال چکا تھا۔ گاڑی شہر کی بھیڑ سے نکل کر مضافاتی سڑک پر مڑ گئی اور قریباً بیس منٹ کی سواری کے بعد ہم ایک کونھی نما جنگل میں داخلے ہو گئے۔ نہ جانے مجھے ایسا کیوں محسوس ہوا کہ اس عمارت کے گردان دیکھی، لیکن کڑی نگرانی کا حصار ہے۔ دربارن بھی نہایت چاک و چوبند اور عام نوکر بھی غیر معمولی طور پر نظریں کھلی رکھنے والے دکھائی دیے۔ مجھے ایک کشادہ ڈرائنگ روم میں پہنچا دیا گیا جس کی چار اطراف کی کھلی کھڑکیوں سے آخر ستمبر کی شام کی نرم دھوپ اور خوشگوار ہوا کے جھونکے، ملائم ریشمی پردوں سے چھن کر میرے چہرے سے ٹکرا رہے تھے۔ کچھ ہی دیر میں ایک اماں بی اپنے پاندان اور ایک سہمی ہوئی سی لڑکی کے ساتھ نمودار ہوئیں۔ میں نے اٹھ کر سلام کیا تو انہوں نے کڑی نظر سے گھورتے ہوئے مجھے دعا دی، اور بولیں ”نام کیا ہے تمہارا.....“

”آیان.....“

”پہلے بھی کہیں ٹیوشن پڑھائی ہے.....“ ”نہیں..... پہلا تجربہ ہے۔“ ”انہوں نے لمبی ہوں کی ”ہونہہ..... کتنا پڑھا ہے تم نے.....“ ”جی ابھی چند دن پہلے بی اے کا آخری پرچہ دیا ہے..... نتیجہ نہیں آیا ابھی تک.....“ ”وہ چونکیں“ ”مطلب ابھی چودھویں پاس بھی نہیں ہو.....؟“ ”میں نے ایک لمبی سانس بھری ”جی نہیں..... فی الحال تو نہیں.....“ ”اور اگر فیل ہو گئے تو.....“

”تو پھر دوبارہ امتحان میں بیٹھوں گا.....“ ”یونیورسٹی تین مواقع دیتی ہے..... پھر بھی کامیاب نہ ہو سکا تو صرف بارہویں پاس ہی کہلاؤں گا۔“ ”میری اکتا ہٹ پردہ کچھ سٹ پچاسی گئیں“ ”لیکن اس طرح تو.....“ ”مگر اس بار لڑکی نے ان کی بات مکمل نہیں ہونے دی۔“ ”اوہو..... بوا..... آپ بھی کمال کرتی ہیں..... انہیں دم تو لینے دیں..... آپ نے تو آتے ہی سوالات کی بوچھاڑ کر دی..... سر آپ بیٹھ جائیں آرام سے..... میرا نام ناہید ہے..... میں ہی آپ کی شاگرد ہوں..... کانٹھ سے بارہویں کا امتحان دوں گی دو ماہ بعد.....“ ”میں نے شکرا دیا کہ بڑی بی کے انٹرویو سے جان چھوٹی، لیکن وہ دو گھنٹے مسلسل وہیں ڈرائنگ روم میں موجود رہیں اور چھالیہ کتر کتر کے پان بناتی رہیں..... بیچ میں دوبار پر تکلف لوازمات کے ساتھ چائے کی ٹرائلی بھی آئی۔ پہلے دن میں نے ناہید کو صرف ابتدائی باتیں بتائیں اور اپنی سمجھ کے مطابق اسے ایک



شیڈول بھی بنا کر دے دیا کہ ہم اگلے دو ماہ امتحان شروع ہونے تک اس ترتیب سے چلیں گے۔ میں نے ناہید کو یہ بھی صاف صاف بتا دیا کہ چونکہ مجھے ٹیوشن پڑھانے کا ذرا بھی تجربہ نہیں ہے اس لیے اگر وہ درمیان میں کہیں بھی محسوس کرے کہ میں اسے ٹھیک طرح سے مضمون سمجھا نہیں پا رہا ہوں تو وہ بلا تکلف مجھے بتا دے اور اپنے لیے کسی نئے استاد کا انتظام کر لے۔ میں نے وہ دو ہزار روپے بھی ہوا کی ہتھیلی پر رکھ دیے کہ مہینہ ختم ہونے پر اگر وہ مطمئن ہوں تب ہی یہ رقم وہ میرے حوالے کریں۔ ہونا نہ ہی کرتی رہ گئیں اور میں پہلے دن کی ٹیوشن ختم کر کے وہاں سے نکل آیا۔ اب یہ میرا روز کا معمول بن گیا تھا۔ چار بجے اسماعیل گاڑی لے کر کیفے فراق آ جاتا اور ساڑھے چھ بجے مجھے چھوڑ جاتا۔ ناہید کافی ذہین طالبہ ثابت ہو رہی تھی۔ ایک دفعہ کوئی بات بتانے کے بعد اسے دوبارہ کبھی وہ سبق دہرانے کی ضرورت پیش نہیں آتی تھی۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ بچپن سے ہی انگریزی میڈیم بورڈنگز میں پڑھتی رہی ہے اس لیے اس کی بنیادی اردو کچھ کم زور رہ گئی تھی۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ مجھے کبھی ناہید کے خاندان میں سے کوئی دوسرا فرد اس گھر میں دکھائی نہیں دیا۔ نہ ہی میں نے پوچھنا مناسب سمجھا۔ میرے لیے اردو پڑھانا بذات خود ایک خوش گوار تجربہ ثابت ہو رہا تھا۔ اور میں ناہید کو پڑھاتے پڑھاتے خود بھی کافی کچھ سیکھ رہا تھا۔

یوں ہی چھ دن گزرے اور آخر اگلی جمعرات بھی آ گئی۔ ہم چاروں صبح سویرے سادات محلے کی چوڑی گلی کے علاقے میں پہنچ گئے۔ منصوبے کے مطابق راجہ، بالے اور مٹھی کو بھتہ لینے والے لڑکوں کو کسی سنان مقام پر روک کر لٹکارنا تھا اور بات بڑھنے کی صورت میں مجھے پیچھے سے ان کی مدد کو آنا تھا۔ وہ تینوں گلی کے ککر پر اور میں گلی کی دوسری جانب ایک چوڑی والے کے ٹھیلے کے عقب میں موجود تھا۔ وقت سرک سرک کے گزر رہا تھا، اور پھر اچانک میں نے چوڑی گلی میں وہی پرانے ماڈل کی ویلیز جیب داخل ہوتے ہوئے دیکھی۔ آج جیب کوئی نیا لڑکا چلا رہا تھا۔ لیکن اس کے پیچھے بیٹھے ہوئے لڑکوں میں شوکی اور تیسرا لڑکا اسی دن والے تھے۔ شوکی نے جیب سے اتر کر ادھر ادھر دیکھا۔ میری ریڑھ کی ہڈی میں سنسنی کی ایک لہری دوڑی۔ مجھے لگا جیسے شوکی کی نظر مجھ سے ٹکرائی ہے۔



## عشق کا عین

عشق کا عین..... علیم الحق حق کے حساس قلم سے، عشق مجازی سے عشق حقیقی تک کے سفر کی داستان، ر، ع..... ش..... ق کے حروف کی آگاہی کا درجہ بہ درجہ احوال۔ دورِ حاضر کا مقبول ترین ناول..... ایک ایسا ناول جو آپ کے سوچنے کا انداز بدل کر آپ کی زندگی میں مثبت تبدیلی لے آئے گا۔ کتاب گھر کے معاشرتی اصلاحی ناول سیکشن میں دستیاب ہے۔

## باب 5

لیکن وہ میرا وہم تھا۔ شوکی نہ جانے کس خیال میں خلا میں گھورتا رہا اور پھر اپنے ہی دھیان میں پلٹ گیا۔ باقی دولڑکے جیپ سے اترے اور اندر دوکان کی جانب بڑھ گئے۔ راجہ پارٹی یہاں سے کچھ دور گلی کے کمر پر جیپ کی رواگلی کا انتظار کر رہی تھی اور میں یہاں سے انہیں دیکھ نہیں سکتا تھا۔ میری بے چینی بڑھتی جا رہی تھی، جانے ان دولڑکوں نے دوکان سے نکلنے میں اتنی دیر کیوں لگا دی تھی، اور پھر اچانک ہی ایک ہنگامہ سا برپا ہوا اور وہ دونوں لڑکے شور مچاتے، گالیاں بکتے کسی شخص کو دھکے دیتے اور مارتے پٹتے دوکان سے باہر نکل آئے۔ کچھ لمحوں کے لیے تو مجھے سمجھ ہی نہیں آیا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے اور پھر جب اچانک میری نظر زیر عتاب شخص پر پڑی تو میرے پیروں تلے سے جیسے زمین ہی نکل گئی۔ وہ شیخ صاحب تھے لیکن ان کا مکان تو چوڑی گلی کے عقب والی گلی میں تھا، تو پھر وہ یہاں.....؟ کیسے؟..... لیکن یہ سب کچھ سوچنے کا وقت ہی کہاں تھا میرے پاس..... میں تیزی سے ان لڑکوں کی طرف دوڑا جو شیخ صاحب کو گھسیٹتے ہوئے شوکی کی جانب لے جا رہے تھے۔ میری زوردار نعرے سے شیخ صاحب کا گریبان ان کے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور ایک لڑکا دور جاگرا۔ یہ ان تینوں کے لیے ضرور کوئی نیا تجربہ رہا ہوگا کیونکہ آج تک وہ دوسروں کو ہی گراتے آئے تھے۔ شوکی کی نظر مجھ پر پڑی تو وہ زور سے چلایا ”یہ تو وہی ہے..... کیسے فراق والا..... آج اس کا دماغ بھی درست کیے دیتے ہیں۔“ گرنے والا لڑکا بھی اب تک سنبھل چکا تھا شوکی کے اشارے پر ان دونوں نے میرے دونوں بازو جکڑ کر پیچھے موڑ دیے اور شوکی مغلضات بکٹا میری جانب لپکا، لیکن وہ یہ بھول گیا کہ میرے ہاتھ بندھے ہیں پاؤں نہیں..... دوسرے ہی لمحے شوکی میری ضرب سے چلاتا ہوا پیچھے جاگرا۔ اس عرصے میں ہمارے آس پاس کافی، بھیر اکٹھی ہو چکی تھی لیکن کسی نے آگے بڑھنے کی جرأت نہیں کی۔ شیخ صاحب ہی ادھر ادھر بھاگ کر لوگوں کی اور ان تینوں کی منت سماجت کرتے رہے..... اب تک شوکی کو یہ بات سمجھ میں آ چکی تھی کہ میں اس کے لیے کوئی سیدھی کھیر ثابت ہونے والا نہیں ہوں۔ بچپن سے لے کر اب تک میں نے اور میرے دوستوں نے ایسی لڑائیوں میں درجنوں بار سر پھوڑے تھے تو خود اپنے ماتھے بھی کھلوائے تھے اور بعد میں گھر جا کر باکی لائیاں الگ کھائی تھیں۔ چند یادگاری نشان تو اب تک میری پیٹھ پر جگمگا رہے تھے۔ شوکی نے اس بار کوئی جلد بازی نہیں کی اور اپنے نیپے سے چاقو نکال کر خاص فلمی انداز میں یکے بعد دیگرے اس کی گراہیاں کھولیں شاید شکار کو مارنے سے پہلے دہشت زدہ کرنے کا اس کا کوئی خاص انداز تھا۔ لڑکوں نے مجھے مزید جکڑ کر پکڑ لیا اور شوکی ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں مہارت سے چاقو منتقل کرتے ہوئے میری جانب بڑھنے لگا۔ شیخ صاحب حواس باختہ ہو کر ہجوم سے مدد طلب کرنے لگے لیکن وہاں ایسا کون تھا جو ہمارے بچ پڑتا..... دفعۃً بھیر میں ہل چل سی ہوئی اور راجہ، بالا اور مشی چینٹے چلاتے اندر گھس آئے۔ شاید انہیں کمر پر کسی نے اطلاع دی تھی کہ کوئی لڑکا بھتہ لینے والوں سے بھڑ گیا ہے۔ شوکی اس صورتحال کے لیے بالکل تیار نہیں تھا۔ راجہ اور بالے نے آتے ہی شوکی کو گرا دیا اور اس پر چڑھ بیٹھے۔ مشی نے میرا ایک بازو چھڑوایا تو باقی دو بھی ہمارے نشانے پر آ گئے۔ اب ہم چار تھے اور وہ تین، اور ہم نے دو ہفتوں سے جو فٹ بال میچ کی پریکٹس چھوڑ رکھی تھی، وہ ساری کی ساری ان تینوں پر پوری کر لی۔ پھر شیخ صاحب نے ہی درمیان

میں پڑ کر بیچ بچاؤ کروایا۔ بالے نے زمین پر نڈھال پڑے شوکی کو ایک جھٹکے سے اٹھایا اور اسے آخری تنبیہ کی کہ وہ دوبارہ اس علاقے میں نظر نہ ہی آئے تو بہتر ہوگا۔ شوکی کی آنکھوں سے اس کے اندر کی حالت عیاں تھی لیکن وہ خون کے گھونٹ پی کر صرف اتنا ہی بولا ”ابھی ایک ملاقات باقی ہے پیارے“ ہمارے لباس مٹی میں لت پت اور کچھ جگہوں سے باقاعدہ پھٹ چکے تھے۔ کچھ ایسا ہی حال شیخ صاحب کا بھی تھا۔ وہ کچھ لڑکھڑا بھی رہے تھے۔ میں نے انہیں سہارے کے ذریعے گھر کے دروازے تک پہنچا کر واپس پلٹنا چاہا تو انہوں نے میرا ہاتھ تھام لیا ”اس حال میں گھر کیسے جاؤ گے میاں.....؟“ دو گھڑی رک کر ہاتھ منہ دھو لو اور چاہو تو میرا کوئی لباس بدل لو.....“ میرے جواب دینے سے پہلے ہی ہماری دی ہوئی دستک کے جواب میں شیخ صاحب کی آواز سن کر اندر سے کسی نے دروازہ کھول دیا اور پھر شیخ صاحب کے ماتھے سے بہتی خون کی ایک پتلی لکیر دیکھتے ہی اندر گھر میں جیسے طوفان سا آگیا۔ شاید وہ بڑی والی ستارہ تھی جس کی چیخ سن کر پہلے اندر کمرے سے شیخانی اور پھر چھوٹی والی گہنا بھی باہر صحن میں نکل آئی، میں شیخ صاحب کو سہارا دے کر اندر لے آیا، دروازہ کھولنے والی باقاعدہ رو رہی تھی اور شیخ صاحب ان سب کو تسلی دینے کی ناکام کوشش کرتے رہے۔ وہ تینوں ماں بیٹیاں اس قدر حواس باختہ ہو گئی تھیں کہ انہیں یہ بھی ہوش نہیں رہا کہ وہ میری موجودگی میں پردہ کر لیں۔ تنویر شاید گھر میں نہیں تھا۔ میں نے ستارہ اور گہنا کی آواز سے ہی ان کے بارے میں اندازہ لگایا تھا ورنہ دیکھنے میں دونوں بہنیں ایک دوسرے کا آئینہ دکھائی دیتی تھیں۔ ستارہ کے سادہ لباس اور چہرے پر پچھلی برسوں اور ملال سے ہی اس کے بڑے ہونے کا اشارہ ملتا تھا ورنہ کون کہہ سکتا تھا کہ اس چھوٹی عمر میں یہ نازک سی لڑکی ماتھے پر بیوگی کا داغ سجائے بیٹھی ہوگی اور گہنا..... وہ تو سرتاپا ”گہنا“ تھی۔ ہلکے فیروز کی رنگ کے کرتا پاجامے میں وہ کسی اور ہی دنیا کی مخلوق دکھائی دے رہی تھی۔ میں ان کے گھر کے صحن میں ایک عجیب و غریب صورت حال میں گرفتار کھڑا تھا۔ نظر اٹھاتا تو وہ دونوں سامنے تھیں اور نظر جھکا تا تو ان کی ٹٹولتی نظریں میرے بوسیدہ لباس اور الجھے ہوئے حلیے میں گڑھ کر مجھے بے چین کر دیتیں۔ آخر شیخ صاحب کو ہی سب سے پہلے خیال آیا اور انہوں نے لڑکیوں کو دوپٹہ اوڑھنے کا حکم دیا اور میرے لیے کوئی مناسب لباس بھی لانے کو کہا۔ میں نہ نہ کرتا رہ گیا لیکن انہوں نے ہاتھ سے پکڑ کر مجھے صحن میں ایک جانب لگے واش بین تک پہنچا دیا۔ میں نے چہرے پر دو چار چھینٹے مارے تو چہرے اور ہاتھوں پر لگی خراشوں میں جما ہوا خون پانی کے ساتھ بہہ گیا، لیکن میری آنکھیں جلنے لگیں۔ میں وہاں سے جلد از جلد جانا چاہتا تھا لیکن شیخ صاحب نے میرا راستہ روک رکھا، اور بے حد اصرار کر کے میرا کرتہ بھی تبدیل کر دیا۔ تنویر کا کرتہ مجھ پر ڈالنا تھا۔ کچھ ہی دیر میں شیخانی جی بیٹھک میں چائے کی ٹرے اٹھا لائیں اور شیخ صاحب بھی نہادھو کر نئے لباس میں میرے ساتھ آکر بیٹھ گئے ”آپ لوگوں نے یہ سب تکلف کیوں کیا.....؟ میرے دوست میرے لیے پریشان ہوتے ہوں گے..... مجھے اب جانا چاہئے.....“ شیخانی جی ممنونیت سے بولیں ”بیٹا ایک کپ چائے پی کر چلے جانا.....“ شیخ صاحب نے ہمیں سب کچھ بتا دیا ہے..... شاید قدرت نے جنہیں ہی اس گھر پر احسانات کرنے کے لیے جن رکھا ہے..... ہم سب تمہارے بہت ممنون ہیں.....“ میں شرمندہ سا ہو گیا۔ ”آپ ایسا کیوں کہہ رہی ہیں..... میری جگہ اور کوئی بھی ہوتا تو وہ ان کا ہاتھ ضرور روکتا۔ یہ محض اتفاق ہے کہ موقع پر میں اور میرے دوست وہاں موجود تھے.....“ شیخ صاحب نے لمبی سی سانس لی ”اسی بات کا تو دکھ ہے میاں..... کہ اس مردہ معاشرے میں اب ظالم کا ہاتھ روکنے والا بھی کوئی نہیں رہا..... یہ صرف تم ہی تھے جو تنہا ان سے بھڑ گئے..... تمہارے دوست تو ذرا دیر میں پہنچے..... اور سچ تو یہ ہے کہ اگر انہیں ذرا سی مزید دیر ہو جاتی تو وہ بھیڑیا تمہاری جان



لینے سے بھی نہ چوکتا۔ تم مانویا نہ مانو۔ میری یہ زندگی اب تمہارا قرض ہے۔“ شیخ صاحب نے بتایا کہ وہ اس وقت اسی دوکان میں گہنا کے لیے کوئی لیس وغیرہ لینے کے لیے چند لمحے رکے تھے جب وہ دوڑ کے مالک دوکان سے ہفتہ لینے کے لیے اندر داخل ہوئے۔ دوکان دار کے پاس اس وقت پوری رقم نہیں تھی لیکن لڑکے اس کی کوئی بات سننے کے لیے تیار نہ تھے۔ مجبوراً شیخ صاحب کو ہی دخل اندازی کرنا پڑی کہ ”یہ کیا طریقہ ہے کسی شریف آدمی سے بات کرنے کا؟“ اور یہ کہ وہ دونوں بٹے کٹے ہیں تو بجائے محنت مزدوری کے وہ دوکانداروں سے یوں زبردستی پیسے جمع کرتے اچھے نہیں لگتے۔“ بس اتنا سننا تھا کہ انہوں نے شیخ صاحب کو دھر لیا۔ اب میں انہیں کیا بتاتا کہ وہ کن پیشہ دروں کے ہتھے چڑھ گئے تھے۔ میں نے دانستہ ان کے سامنے سارنگا کا نام نہیں لیا۔ وہ دوسرے شہر سے آئے تھے۔ انہیں ان جھیلوں سے دور ہی رہنا چاہئے تھا۔ چائے ختم کر کے میں نے ان سے اجازت طلب کی اور بڑی مشکل سے انہیں دروازے تک آنے سے روکا کیونکہ انہیں آرام کی ضرورت تھی۔ میں صحن کے دروازہ تک پہنچا ہی تھا کہ میرے عقب سے ایک آواز ابھری ”سینے“ میں چونک کر پلٹا۔ برآمدے کی جافری کے پیچھے ستارہ اور گہنا کٹھی سنائی سی کھڑی تھیں ”جی؟“ کچھ دیر دونوں بہنوں میں بات شروع کرنے کے لیے ہنکچاہٹ آمیز اشارے ہوئے پھر گہنا نے ہی ہمت کی ”وہ دراصل ہم یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ بات زیادہ بڑھ تو نہیں جائے گی؟ دراصل بڑے بھیا بھی ابا کے سہارے کے لیے یہاں موجود نہیں ہیں اور تو میری بھائی پہلے ہی ہماری وجہ سے کافی پریشانیوں کا شکار ہیں۔ ہم نہیں چاہتے کہ ہماری وجہ سے انہیں کوئی تکلیف ہو۔“ بات کے دوران ایک پتلی سی شریٹ گہنا کو مستقل ستاتی رہی۔ یہ لڑکیاں اپنے والدین اور خاص طور پر اپنے باپ کے لیے اتنی ڈھیر ساری پریشانی جانے کہاں سے اکٹھی کر لاتی ہیں۔ شاید آسمان پر جب روحوں کو کوئی فیض بانٹا جاتا ہوگا تو ان کے حصے میں یہی انعام آتا ہوگا۔ میں نے ان پریشان روحوں کو تسلی دی۔

”آپ مطمئن رہیں۔ شیخ صاحب کو مزید کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔ اگر ضرورت پڑی تو ہم دوستوں میں سے کوئی ایک مستقل آپ کے گھر کے باہر پہرہ بھی دے سکتا ہے۔ بس آپ لوگ انہیں ایک آدھ دن گھر سے باہر نہ جانے دیجئے گا۔“ ستارہ نے مومنیت بھری آواز میں شکر یہ کہا اور اندر پلٹ گئی لیکن گہنا کو مڑتے مڑتے پھر کوئی بات یاد آگئی۔ ”وہ دراصل۔۔۔۔۔“ میں چلتے چلتے پھر رک گیا۔ ”دراصل میں آپ سے اپنے گزشتہ رویے کی معافی بھی مانگنا چاہتی ہوں۔ میرا مقصد آپ کی دل آزاری نہیں تھا۔۔۔۔۔“ میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ ابھری۔ ”آپ کے ابا آپ کو ٹھیک ہی نادان بنی کہتے ہیں، کیا یاد کریں گی۔۔۔۔۔“ گہنا مسکرا دی۔ ”یہی میرا مقصد بھی تھا کہ وہ نازک اندام شیخ صاحب کی پریشانی سے باہر نکل آئے۔ اس کے ماتھے پر بڑی شکنیں دور ہوئیں تو جیسے دنیا کی ہر سلوث دور ہوگئی۔ وہ دھیرے سے شکر یہ کہہ کر پلٹ گئی اور میں وہیں جما کھڑا رہ گیا۔ یہ مجھے کیا ہو رہا تھا؟ پہلے تو کبھی میرے اندر ایسی پروانیاں نہیں چلی تھیں کہ باہر چمکتی دھوپ بھی مجھے سایہ لگنے لگی تھی۔ میں جانے کس عالم میں کیسے فراق تک پہنچا۔ رعبہ پارٹی وہیں میرا انتظار کر رہی تھی لیکن مجھے ان کی باتیں بالکل سمجھ نہیں آرہی تھیں۔ میں بس خواخواہ ہوں ہاں کرتا رہا۔ جانے آس پاس کون کیا کر رہا تھا۔ سب لوگ خاموش تھے یہ سبھی کچھ بول رہے تھے۔۔۔۔۔ مجھے کچھ خبر نہیں تھی۔ جانے کب دوپہر ڈھلی اور کب اسماعیل گاڑی لیے مجھے لینے کے لیے آ بھی گیا۔ اس دن ٹیوشن کے دوران ناہید نے بھی میری ذہنی غیر موجودگی کو محسوس کر لیا۔

”سر۔۔۔۔۔ کیا بات ہے۔۔۔۔۔ آپ کچھ پریشان سے لگ رہے ہیں سب ٹھیک تو ہے۔۔۔۔۔“

میں نے چونک کر اسے دیکھا۔ گویا مجھے جوہر ہاتھ اور صرف میرے اندر تک محدود نہیں تھا۔ وہ تو میرے پوروں اور میرے مساموں سے جھلک کر باقی دنیا کو بھی جگمگ رہا تھا۔ میں نے سر جھٹک کر ایک بار پھر دھیان کتاب کی طرف منتقل کرنے کی کوشش کی۔ ناہید غور سے میری جانب دیکھتی رہی۔ پھر جھجھکتے ہوئے بولی۔

”سرا ایک بات کہوں..... اگر آپ برائے نامیں تو.....؟“

”نہیں نہیں..... تم ضرور کہو.....“ دور ٹٹھی بوانے بھی ناہید کی بات سن کر سر اٹھایا۔

”سرا اگر آپ اجازت دیں تو میں آپ کو آیاں بھائی کہہ لیا کروں..... میرا کوئی بھائی نہیں ہے..... جو تھا اسے خدا نے چھین لیا..... آپ کو جب میں نے پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔ آپ مجھے بالکل اپنے بھیا جیسے ہی لگے تھے..... میں نے کبھی آپ کو دل سے اپنا استاد تسلیم نہیں کیا..... ہمیشہ ایسا ہی محسوس ہوا جیسے میرے بھیا مجھے پڑھا رہے ہیں.....“ بوا کی آنکھیں بھرا آئیں جنہیں چھپانے کے لیے وہ تیزی سے چھالہ کتر نے لگیں۔ مجھے پہلی بار پتہ چلا کہ ناہید کا کوئی بھائی بھی تھا جو اب اس دنیا میں نہیں ہے۔ خود ناہید بھی بولتے بولتے اپنی آواز کھونٹھی۔ ”ٹھیک ہے..... لیکن تمہارا بھیا بننے کے لیے میری بھی ایک شرط ہے.....“

”جی بتائیے..... میں ہر شرط پوری کروں گی.....“

”سوچ لو..... کہیں بعد میں مکر نہ جانا..... میری شرط یہ ہے کہ اب یہ اداسی کبھی ناہید کے قریب بھی نہ پھٹکنے پائے..... ورنہ میں بھائی سے ایک سخت گیر ٹیوٹر بننے میں ذرا سی بھی دیر نہیں کروں گا۔“ بوا ہنس پڑیں..... ناہید کی آنکھوں کے ستارے بھی جھللا اٹھے۔ میں نے اسے چھوٹی رافہ کے بارے میں بتایا کہ اسی کی طرح کی ایک شرارتی بی، خود ہمارے گھر میں بھی موجود ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ اب دو بلیاں میرا سر کھایا کریں گی۔ اس روز ٹیوٹر ختم کر کے میں گھر واپس جانے لگا تو بوانے پہلی مرتبہ اٹھ کر میرے سر پر ہاتھ رکھ کر دعا دی۔ ”جیتے رہو.....“ میں مسکرا کر باہر نکل آیا۔

لیکن میری یہ مسکراہٹ اتنی عارضی ثابت ہو گئی یہ میں نے کبھی نہیں سوچا تھا۔ جیسے ہی میں کیفے فراق کے پاس پہنچا تو لوگوں کی بھیڑ دیکھ کر میرا ہاتھ ٹھکا۔ اسماعیل بھی معاملہ جاننے کے لیے وہیں رک گیا۔ مجھے گاڑی سے اترتے دیکھ کر مرزا میری جانب لپکا ”غضب ہو گیا انویار..... پولیس راجہ، ہالے اور مشی کو پکڑ کر تھانے لے گئی ہے..... فراق چچا بھی انہی کو چھڑانے تھانے گئے ہیں۔“ میں نے پریشانی سے پوچھا۔

”تھانے لے گئے ہیں..... لیکن کیوں.....؟“

”پتہ نہیں..... کہہ رہے تھے کہ آج دن میں تم لوگوں نے کچھ لڑکوں کو حملہ کر کے جان سے مارنے کی کوشش کی ہے..... پولیس تمہارا بھی پتہ پوچھ رہی تھی..... میں تو کہتا ہوں کہ تم فوراً یہاں سے نو دو گیارہ ہو جاؤ..... ورنہ وہ تمہیں بھی دھر لیں گے.....“

میں نے اسماعیل کی طرف دیکھا۔

”میرا ایک کام کرو گے.....“ اسماعیل مسکرایا ”ضرور..... کہاں جا کر چھپنا چاہتے ہو..... میں پہنچا آتا ہوں.....“

”مجھے علاقے کے تھانے تک جانا ہے..... لیکن بہت جلدی.....“ اسماعیل زور سے چونکا ”پولیس تمہاری تلاش میں چھاپے مار رہی ہے“

اور تم خود تھانے جا کر ان کا نوالہ بننا چاہتے ہو.....“ مرزا بھی چلایا

”آیاں..... یہ کیا بے وقوفی ہے..... تمہارے جانے سے وہ لوگ باقی تین کو چھوڑ تو نہیں دیں گے.....“ میں نے گاڑی میں بیٹھتے ہوئے

جواب دیا ”ہاں..... مگر مجھے یہ اطمینان تو رہے گا کہ میں ان کے ساتھ ہوں.....“ اسماعیل نے گاڑی آگے بڑھادی اور ہم کچھ ہی دیر میں تھانے کی

بیرونی سڑک پر جا کر اسماعیل نے مجھ سے کہا ”اگر میری کسی مدد کی ضرورت ہے تو میں رک جاؤں۔“

”نہیں..... تم نے مجھے یہاں تک پہنچا دیا۔ یہی بڑی مدد ہے.....“ اسماعیل نے گرم جوشی سے مجھ سے ہاتھ ملایا ”آج تک میں تمہیں

صرف ناہید بیٹا کا استاد سمجھتا تھا..... لیکن آج پتہ چلا کہ تم ایک بہت اچھے دوست بھی ہو..... اور اسماعیل کے دل میں یاروں کی بڑی قدر ہے

بابو..... کبھی وقت پڑے تو یاد کر لینا.....“ اسماعیل نے گاڑی گیر میں ڈال دی۔ میں تھانے میں داخل ہوا۔ تو سب سے پہلے ایس ایچ او کے کمرے

سے نکلے اے ایس آئی کی مجھ پر نظر پڑی۔ شاید وہ مجھے جانتا تھا تبھی اٹنے بیروں واپس اندر لپکا۔ میں نے ایس ایچ او کے کمرے کے دروازے پر

کھڑے ہو کر اجازت طلب کی۔

”کیا میں اندر آ سکتا ہوں.....؟“

تب تک اے ایس آئی تھانیدار کے کان میں میرا تعارف پھونک چکا تھا۔

تھانیدار نے غور سے میری جانب دیکھا۔

”اوہ..... میں تو سمجھ رہا تھا کہ تمہیں پکڑ کر لانے کے لیے ہمیں اپنی آج کی رات برباد کرنی پڑے گی..... لیکن شاباش ہے تمہاری جرأت

کو..... تم تو خود ہی چلے آئے.....“ وہ اے ایس آئی کی جانب مڑا ”ڈال دو اسے بھی لاک اپ میں، باقی کارروائی بڑے صاحب کے آنے کے بعد ہوگی۔“

”لیکن ہمارا جرم کیا ہے؟“

”خوب..... جرم بھی مجھی سے پوچھ رہے ہو..... تم لوگوں کے خلاف پرچہ کنوایا گیا ہے آج صبح ساڑھے گیارہ بجے کے قریب تم لوگوں نے

شوکی ولد عنایت اور دیگر دو پر جان لیوا حملہ کیا اور انہیں شدید زخمی حالت میں چھوڑ کر وہاں سے فرار ہو گئے.....“

”یہ غلط ہے..... وہ سارنگا کے آدمی تھے جو بہتہ لینے آئے تھے اور ایک بزرگ کو زد و کوب کر رہے تھے ہم نے صرف اس بزرگ کی مدد کی

تھی..... اور بس.....“

”شاباش..... بھئی جو انا..... کون کہتا ہے کہ اس ملک میں ہیروئز کی کمی ہے..... اچھا تو اب یہ بھی بتا دو کہ وہ بزرگوار اس وقت کہاں

ہیں..... اور تمہارے ساتھ کیوں نہیں آئے۔ تمہارے ساتھیوں کو چھڑانے کے لیے.....؟“ میں کچھ کہتے کہتے رک گیا۔ ستارہ اور گہنا سے کیا وعدہ یاد

آ گیا کہ اب ان کے ابا کا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں۔

کچھ ہی دیر میں مجھے بھی حوالات میں پہنچا دیا گیا جہاں پہلے ہی تین نوآموز قیدی پڑے ہوئے تھے۔ راجہ لہک لہک کر گارہا تھا ”کون کسی

کو..... باندھ سکا..... صیاد تو اک دیوانہ ہے.....“ مجھے دیکھتے ہی تینوں نے زوردار نعرہ لگایا ”آ گیا وہ شاہ کار..... تھا جس کا انتظار..... سچ یار



انہو..... تیرے بغیر بڑا سونا پن تھا اس حوالات میں..... اب تم آگے ہو تو شاید کچھ دل لگ جائے.....“

میں نے رعبہ کے سر پر ایک چپت رسید کی ”اتھو..... پولیس کے ہتھے چڑھنے کی کیا ضرورت تھی..... کہیں چھپ نہیں سکتے تھے.....؟ اب پولیس ہمارے ساتھ جو دل لگی کرے گی اس سے تم سب کا دل خوب لگ جائے گا یہاں.....“ مٹی روہا نسا ہو گیا ”یار چھپنے کی مہلت ہی کہاں ملی..... آنا فانا دھر لیا ہم سب کو ہاں..... یار آیاں..... سچ بتاؤ..... اب کیا ہوگا..... کانٹیل بتا رہا تھا کہ جب ان کے بڑے صاحب آئیں گے تو ہمیں بہت مار پڑے گی.....؟..... یہ لوگ ہمیں ماریں گے کیا.....؟

”پولیس کا گزشتہ ریکارڈ دیکھتے ہوئے تو یہی کہا جاسکتا ہے کہ اس کانٹیل کی ہمشین گوئی سو فیصد درست ثابت ہوگی، لیکن تم فکر نہ کرو..... معجزات بھی تو اسی دنیا میں ہی رونما ہوتے ہیں ناں.....“ مٹی کا اترا ہوا چہرہ مزید اتر گیا، کچھ ہی دیر میں حوالات میں شام کا اندھیرا اتر آیا، اور پھر اچانک ہی باہر کچھ بل چل مچی۔ ایک سنتری نے آکر ہمیں زور سے جھاڑا ”چلو اٹھو اونے..... بڑے صاحب تم لوگوں کو بلارہے ہیں۔“



## جو چلے تو جاں سے گرا گئے

ماہا ملک کا یہ خوبصورت ناول ہمارے اپنے ہی معاشرے کی کہانی ہے۔ اسکے کردار ماورائی یا تصوراتی نہیں ہیں۔ یہ جیتے جاگتے کردار اسی معاشرے کا حصہ ہیں۔ زندگی کی راہوں میں ہم سے قدم قدم پر ٹکراتے ہیں۔ یہ کردار محبت کے فریونوں سے بھی واقف ہیں اور رقابت اور نفرت کے آداب نبھانا بھی جانتے ہیں۔ انہیں جینے کا ہنر بھی آتا ہے اور مرنے کا سلیقہ بھی۔ خیر و شر، ہر آدمی کی فطرت کے بنیادی عناصر ہیں۔ ہر شخص کا خیر انہی دو عناصر سے گندھا ہوا ہے۔ ان کی کشش غالب ایسے شاعر سے کہلواتی ہے۔ آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا۔ آدمی سے انسان ہونے کا سفر بڑا کٹھن اور صبر آزما ہوتا ہے۔ لیکن ”انسان“ درحقیقت وہی ہے جس کا ”شر“ اس کے ”خیر“ کو شکست نہیں دے پایا، جس کے اندر ”خیر“ کا الاؤ روشن رہتا ہے۔ یہی احساس اس ناول کی اساس ہے۔ جو چلے تو جاں سے گرا گئے کتاب گھر پر دستیاب۔ جسے ناول سیکشن میں دیکھا جاسکتا ہے۔

## باب 6

ہم چاروں نے ایک دوسرے کی طرف یوں دیکھا جیسے ہم آخری بار ایک دوسرے کو دیکھ رہے ہوں۔ سنتری نے حوالات کا دروازہ کھولا اور ہمیں ہانک کر ایک بڑے ہال نما کمرے کی طرف لے گیا۔ مٹی نے آہستہ سے مجھ سے پوچھا ”انو..... کیا یہ لوگ ہمیں مار چر سیل کی طرف لے جا رہے ہیں.....؟“ سنتری نے زور سے ”شش.....“ کی آواز نکال کر ہمیں خاموش رہنے کی تنبیہ کی۔ ہال میں تین کانٹیل، تھانے دار اور ایک جوان آفیسر موجود تھا۔ ریحان سے سال دو سال ہی بڑا ہوگا عمر میں..... ہمیں ایک قطار میں مؤدب سا بنا کر کھڑا کر دیا گیا۔ نو جوان افسر کوئی براہ راست بھرتی شدہ اے ایس پی تھا۔ اس نے غور سے ہماری جانب دیکھا..... ”اچھا تو یہی چاروں ہیں..... پرچکاٹ دیا ہے تم لوگوں نے.....؟“ تھانے دار نے مستعدی سے جواب دیا۔ ”نہیں سر..... آپ کی اجازت کے بغیر کیسے کاٹ سکتے تھے..... ویسے چاروں نے بہت ادھم مچا رکھا تھا علاقے میں.....“ ہم نے نظریں اٹھا کر حیرت سے تھانیدار کی طرف دیکھا۔ ہم علاقے میں ادھم مچائے ہوئے تھے اور خود ہی کو پتہ نہیں تھا۔ اے ایس پی نے لمبی سی ہوں کی اور ہم چاروں کو غور سے دیکھا اور پھر اس کی نظر مٹی پر رک کر ٹک سی گئی۔ پھر وہ حیرت سے بولا ”یہ نیکو بھی ان بد معاشوں کے ساتھ ہے۔ چہرے سے تو یہ کوئی پڑھا کو قسم کا لڑکا لگتا ہے۔“ مٹی نے گھکھیا کر کہا ”ہم بد معاش نہیں ہیں جناب..... وہ لڑکے وہاں بہتہ لینے کے لیے آئے تھے“

اسنے میں باہر سے کچھ شور اور بحث کی آوازیں ابھریں اور پھر ایک سنتری نے اندر آ کر اطلاع دی ”جناب ان لڑکوں کے گھر والے آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔“ اے ایس پی نے سنتری کو جھانڈ دیا ”کہہ دو ان سے میں فی الحال کسی سے نہیں مل سکتا اور سب سے پہلے ان چاروں کے کوائف نوٹ کر کے میرے دفتر پہنچاؤ۔“ اے ایس پی تھانیدار کے ساتھ باتوں میں مصروف ہو گیا اور ایک سپاہی نے ہمارے نام بمعہ ولدیت اور پتے وغیرہ لکھنا شروع کر دیے۔ میرا نام تیسرا تھا ”آیان احمد ولد تو قیر احمد، پیشہ ریٹائر ہڈ ماسٹر، گورنمنٹ اسکول“ اے ایس پی نے چونک کر میری طرف دیکھا ”اپنے والد کا نام پھر سے دہراؤ.....“ میں نے پھر سے ابا کا نام اور پیشہ دہرایا ”تم تو قیر احمد صاحب کے بیٹے ہو..... آئی کانٹ بلیواٹ..... وہ آج کل کہاں ہوتے ہیں.....؟“ پھر میرا جواب سننے بغیر اس نے ملاقاتیوں کے آنے کی اطلاع کرنے والے سنتری سے ان کی فہرست لانے کو کہا۔ سنتری بھاگ کر گیا اور کچھ ہی دیر میں سب نام لکھ کر لے آیا۔ اے ایس پی نے فہرست پر نظر ڈالی اور سنتری سے کہا ”ان سب کو میرے دفتر میں بٹھاؤ..... میں ابھی آتا ہوں“ سنتری سیلوٹ کر کے واپس لپکا۔ اے ایس پی ہمیں وہیں کھڑا رکھنے کا حکم دے کر اپنی ٹوپی سیدھی کرتا ہوا باہر نکل گیا۔ پتہ نہیں اے ایس پی ابا کا نام سن کر ایسے چونکا کیوں تھا۔ مگر میرا دل تو یہی سوچ کر بیٹھا جا رہا تھا کہ اگر ابا بھی باہر موجود ہوئے تو میرا کیا ہوگا۔ کچھ ہی دیر میں ایک سپاہی نے آ کر اطلاع دی کہ ”ہم چاروں کو بڑے صاحب نے دفتر بلایا ہے۔“

اور پھر وہی ہوا جس کا مجھے ڈر تھا۔ جیسے ہی ہم اے ایس پی کے کمرے میں داخل ہوئے تو سب سے پہلے میری نظر بالے کے ابا کے ساتھ بیٹھے ہوئے اپنے ابا پر پڑی۔ پس منظر میں ریحان بھی باقی اباؤں کے ساتھ بیٹھا نظر آیا لیکن اس کے چہرے پر بھی ہوائیاں سی اڑ رہی تھیں۔ ہمیں

دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑا رہنے کا حکم دے کر سپاہی باہر نکل گیا۔ اے ایس پی نے اپنی بات جاری رکھی ”سر میں تو آپ کا نام سن کر ہی چونک گیا تھا۔ آپ کو شاید یاد نہ ہو..... میں نے چھٹی اور ساتویں جماعت آپ کے ہی سکول سے پاس کی تھی۔ پھر بورڈنگ میں داخل ہو گیا اور میں دوسرے شہر چلا گیا تھا..... ابھی دو سال پہلے ہی میں نے سی ایس ایس کلیئر کیا ہے..... میں تو آج بھی مانتا ہوں کہ میری تعلیم کی بنیاد رکھنے میں آپ کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔“ ابا سر جھکائے بیٹھے تھے ”ہاں میاں..... یہ تو تمہاری اعلیٰ ظرفی ہے کہ تم نے میری محنت کی لاج رکھ لی۔ ورنہ یہاں تو خود میرا اپنا خون میری بنیادیں کھوکھلی کر رہا ہے۔ مجھے تو اسے اپنا بیٹا کہنے میں بھی شرم آتی ہے..... کہیں منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑا مجھے.....“

”بہر حال سر..... میرا مشورہ یہی ہے کہ یہ ان لڑکوں سے تھانے کے باہر راضی نامہ کر لیں تو ان کے لیے بہتر ہوگا۔ وہ اونچی پہنچ والے لوگ ہیں، اور قانون گواہ اور ثبوت کی بنیاد پر فیصلے کرتا ہے، لیکن اس معاملے میں آپ کے بیٹے اور اس کے دوستوں کے حق میں نہ تو کوئی گواہ ہے..... اور نہ ہی ثبوت..... اگر ایک بار تھانے کچہری کی مہر لگ گئی اور انہوں نے ملزم سے مجرم تک کا سفر طے کر لیا تو ان چاروں کا تعلیمی کیریئر ہمیشہ کے لیے برباد ہو جائے گا..... میں آج انہیں صرف آپ کی وجہ سے جانے دیتا ہوں، لیکن یہ جھگڑا جس قدر جلد ختم ہو جائے اتنا ہی ان سب کے لیے بہتر ہوگا۔ آپ لوگ اپنے بیٹوں کو لے جاسکتے ہیں۔“

ابانے زہریلی نظروں سے ہم سب کی طرف دیکھا ”چلو اب.....“

ہم لوگ تھانے سے باہر نکلے تو کبھی خاموش تھے۔ پھر سب سے پہلے مٹی کے ابانے اس کے کان کھینچنے ”کہا تھا میں نے..... چھوڑ دے ان لوغروں کی دوستی..... کھلا دی نہ آج جیل کی ہوا تھجے..... اور نہ مان اپنے باپ کی بات.....“ دوسری جانب سے بالے کے ابانے اسے لتاڑا ”سن لے..... آج تیری وجہ سے کیا کیا سننے کو مل رہا ہے..... بروں کی صحبت میں بیٹھے گا تو یہی سب کچھ ہوگا۔“ پھر بھلا راہہ کے ابا کہاں چپ رہنے والے تھے ”ہاں ہاں..... لوغروں کی صحبت میں لوغرنہ بنے گا تو کیا حاجتی بنے گا، خبردار جو تو نے آئندہ ان تینوں کی شکل بھی دیکھی تو..... کام کے نہ کاج کے..... دشمن اناج کے.....“ اور پھر سب سے آخر میں مغل اعظم گرجے۔

”بس..... بہت ہو گیا..... گھر چلو..... انتہا ہو گئی بے غیرتی کی.....“ ہم چاروں کو ہمارے بڑوں نے چار مختلف سمتوں میں بھیجا اور ہم ایک دوسرے کو حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے یوں ایک دوسرے سے جدا ہوئے جیسے پلیٹ فارم سے چھوٹی گاڑی میں بیٹھ کر جاتے پیاروں سے اسٹیشن پر کھڑے اپنوں کے ہاتھ چھوٹتے ہیں۔ بچپن سے آج تک کئی بار محلے میں مختلف شرارتوں کی سزا کے طور پر ہمیں اسی طرح کھینچ کر علیحدہ کر دیا جاتا تھا، کئی کئی دن ملنے نہیں دیا جاتا تھا۔ ہم اپنی آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو لیے کھٹسے بازو کے باوجود پلٹ پلٹ کر ایک دوسرے کو اسی طرح دیکھا کرتے تھے اور پھر چند دن بعد ہی سب سے نظر بچا کر پھر سے اکٹھے ہو جاتے تھے، لیکن جانے کیوں اس بار جدا ہوتے ہوئے میرا دل بیٹھا جا رہا تھا۔

ہم گھر میں داخل ہوئے تو امی برآمدے میں جائے نماز بچھائے گڑ گڑا کر دعا مانگتی نظر آئیں۔ چھوٹی بھی ان کے ساتھ بیٹھی تسبیح پھیر رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی دونوں جلدی سے میری جانب لپکیں۔ ”آگیا تو انو..... ان لوگوں نے تجھے مارا پٹا تو نہیں.....؟“ امی نے جلدی جلدی میرا جسم ٹٹول کر یوں دیکھا جیسے وہ بچپن میں تب دیکھتی تھیں جب میں باہر سے کوئی چوٹ کھا کر گھر آتا تھا۔ دنیا بدل جائے تو بدل جائے پر یہ مانیں کبھی نہیں بدلتیں۔ ابا



دھاڑے ”وہ اس کی ہڈی پہلی ایک کر دیتے تو مجھے زیادہ خوش ہوتی۔ آوارہ اور لوفر تو پہلے ہی سے تھا۔۔۔۔۔ اب غنڈہ گردی بھی شروع کر دی ہے تمہارے سپوت نے۔۔۔۔۔ میری برسوں کی کمائی عزت ایک دن میں خاک کر کے رکھ دی۔۔۔۔۔ پوچھا اس سے کہ اب کون سا تمغہ سینے پر سجا کر آیا ہے تھانے سے۔۔۔۔۔ میں سر جھکائے کھڑا رہا۔۔۔۔۔ میں نے صرف ایک بزرگ کی مدد کی تھی۔ وہ لڑکے انہیں پیٹ رہے تھے۔۔۔۔۔ ابا زور سے چلائے ”کیا ضرورت تھی اس خدائی خدمت گاری کی۔۔۔۔۔ وہاں پر موجود باقی لوگ مر گئے تھے کیا۔۔۔۔۔؟“

”نہیں۔۔۔۔۔ لیکن کوئی ان کی مدد کو آگے نہیں بڑھا۔ میں نے وہی کیا جو مجھے کرنا چاہیے تھا۔“ ابا کے صبر کا پیمانہ لہریز ہو گیا اور انہوں نے غصے میں اپنی چھڑی اٹھالی ”زبان چلاتا ہے باپ کے سامنے۔۔۔۔۔ پھر وہی ہوا جو ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے۔ ابا کی چھڑی اور میری پیٹھ۔۔۔۔۔ میں چپ چپ مار کھاتا رہا اور بے چاری امی اور رافعہ اپنے ہاتھوں پر میرے جھسے کے وار کرتی گئیں۔ جانے ہمارے والدین ہمیں بچپن میں جن باتوں کا درس دیتے ہیں جوان ہونے پر ہمیں انہی باتوں پر مار کیوں پڑتی ہے؟ دوسروں کی مدد، ظلم کے خلاف بغاوت اور برائی کے خلاف ڈٹ جانا، ایسے جانے کتنے سبق میں نے اپنی کتابوں میں اپنے انہی ابا سے پڑھے تھے جو آج مجھے کسی دوسرے کی مدد کے لیے کود پڑنے پر مار رہے تھے۔ کاش وہ سارے سبق پڑھاتے وقت ابا مجھے یہ بھی بتا دیتے کہ بیٹا یہ کتابیں صرف امتحان پاس کرنے کے لیے ہیں۔ ان پر کبھی عمل نہ کرنا۔۔۔۔۔ کیونکہ ہم عزت دار لوگ پولیس یا کچھری کا سامنا نہیں کر سکتے۔ سواگر کہیں کچھ غلط ہوتے دیکھو تو چپ کر کے آگے بڑھ جانا مگر خود کو کسی جھیلے میں نہ ڈالنا۔ کیونکہ یہ اچھائی اور بھلائی کی جذباتی باتیں صرف کتابوں میں ہی اچھی لگتی ہیں۔

ہمیشہ کی طرح ابا کی اس مشق کا اختتام بھی چھڑی کے ٹوٹ جانے پر ہی ہوا۔ حسب معمول امی نے روتے ہوئے اپنے کمرے میں جا کر باہم کی شیشی چھوٹی کے حوالے کی کہ وہ بھائی کے نیلوں پر مل دے، اور پھر ہمیشہ کی طرح ریحان اور چھوٹی بہت دیر تک چھت پر میرے کمرے میں بیٹھے میرے زخموں پر مرہم رکھتے اور میرا دماغ کھاتے رہے کہ آخر میں کب سدھروں گا؟ آخر کار میں نے ہی ان کے سامنے ہاتھ جوڑے کہ اب وہ دونوں اپنی ”اقوال زریں“ نما نصیحتوں کے ساتھ یہاں سے روانگی اختیار کریں کیونکہ مجھے نیند آ رہی ہے۔ مگر میں ان دونوں کے جانے کے بعد بھی بہت دیر تک کروٹیں بدلتا رہا۔ جب بھی میں آنکھیں بند کرنے کی کوشش کرتا میری پلکوں کے پیچھے ایک من موہنی سی صورت چھم سے ابھر آتی ”گہنا۔۔۔۔۔“ آخر کار میں اٹھ بیٹھا اور دو چار مرتبہ زور سے اپنے سر کو جھٹکا، لیکن کاش سر جھٹکنے سے من میں لمبی صورتوں کی ہمیشہ بھی ذہن سے اتر جاتی۔ میں جتنا اپنا دھیان کسی اور جانب لگانے کی کوشش کرتا اتنا ہی وہ میرے ذہن اور دل کی تہوں میں اترتی جاتی تھی۔ یہ مجھے کیا ہو رہا تھا۔ آج تک پہلے کبھی تو یہ میٹھی سی کسک میرے اندر نہیں جا گئی تھی کیوں مجھے آس پاس کی ہر چیز خواہ مخواہ ہی اچھی لگ رہی تھی؟ کیوں رات کا ایک ایک پہر پوری پوری رات کی طرح ڈھل کر مجھ پر بیت رہا تھا۔ کیا یہ وہی جذبہ تھا جسے ساری دنیا محبت کے نام سے پکارتی ہے۔ لیکن ”محبت“ اور آیان احمد کو۔۔۔۔۔؟؟ نہیں نہیں۔۔۔۔۔ میں بھلا ان خرافات پر کب یقین کرنے والا تھا۔ ضرور ابا کی چھڑی مجھ پر برسے وقت میرے دماغ کی کسی ایسی رگ کو چھو گئی ہوگی جو من مندر میں ایسی روشنی بھر جاتی ہوگی۔ صبح تک میں ضرور اس سحر سے نکل آؤں گا، لیکن تب میں شاید یہ نہیں جانتا تھا کہ محبت سحر نہیں۔۔۔۔۔ وہ کالا جادو ہے جس کا توڑ دنیا کے کسی ساحر کے پاس نہیں۔۔۔۔۔ یا شاید موت کی طرح محبت بھی ایک واپس نہ پلٹنے والے عمل کے طور پر اس دنیا میں وارد ہوتی ہے، اور ہم معصوم انسان

ساری عمر بے خبری میں اس جادوؤں نے کا توڑ تلاش کرتے رہتے ہیں۔

صبح میرے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔ درو گھٹنے کے بجائے بڑھتا گیا۔ بے چینی کم سے فزوں تر ہوتی گئی۔ دل ویرانہ تلاش کرنے لگا اور باتیں اضافی لگنے لگیں۔ مجھے یوں گم سم دیکھ کر امی میری چپ کا مطلب میری ابا سے ناراضگی سمجھیں۔ میرا جی خوش کرنے کے لیے انہوں نے دبے الفاظ میں ابا کے خلاف ایک آدھ بات بھی کہہ دی کہ ”بھلا کون اپنی جوان اولاد کو یوں چھڑی سے پٹیتا ہے“ اور یہ کہ ”اگر میرا دل ابا کی جانب سے خراب ہے تو ہونا بھی چاہئے.....“ وغیرہ وغیرہ۔ لیکن اب میں اپنی بھولی ماں کو یہ کیسے سمجھاتا کہ میرا دل تو نہ جانے میرے ساتھ کتنی بڑی سازش کر بیٹھا ہے اور سادات محلے جانے کے کتنے ہی بہانے تراش کر خود ہی انہیں رو کر رہا ہے۔ آج میرے دوستوں میں سے بھی کوئی دن چڑھے تک گلی یا چھت پر نہیں آیا۔ میں جانتا تھا کہ میری طرح آج ان تینوں کی بھی ”خصوصی نگرانی“ کی جارہی ہوگی۔ میری طرح سبھی کے والدین انہیں گھر کے صحن میں بٹھا کر یہ تبلیغ کر رہے ہوں گے کہ انہیں اس حال تک پہنچانے والے اور کوئی نہیں..... بس وہ آوارہ دوست ہیں۔ عام حالات میں ایسے موقعوں پر میں بے شکل ابا کے گھر سے نکلنے کا انتظار کیا کرتا تھا اور ان کا قدم گھر سے باہر پڑتے ہی میں امی اور چھوٹی کی ہزار منت سماجت کے باوجود گھر سے باہر نکل جاتا تھا لیکن اس روز جب بارہ بجے کے قریب ابا حسب معمول کپڑے کا تھیلہ اپنی سائیکل سے لٹکائے باہر سودا سلف لینے کے لیے چلے بھی گئے اور میں پھر بھی صحن میں لگی انگور کی تیل کے نیچے بیٹھا خشک پتوں کو اپنے ہاتھ سے مستار ہا تو امی کو میری فکر لاحق ہو گئی۔ انہوں نے جلدی سے آگے بڑھ کر میرے ماتھے کو چھو کر دیکھا ”انوں..... تیری طبیعت تو ٹھیک ہے نا.....“ میں چپ چاپ اٹھ کر چھت پر چلا آیا، اور ریحان اور چھوٹی کے درجنوں بار بلانے پر بھی دن کے کھانے کے لیے نیچے نہیں اترا۔ چار بجے کے قریب جب میرے گھر والوں نے باقاعدہ چھت کی ڈیوڑھی سے مجھے جھانک جھانک کر تکتا شروع کر دیا تو میں جھنجھلا کر گھر سے باہر نکل آیا۔ کیفے فراق کے باہر اسماعیل میرا انتظار کرتے کرتے اب واپس جانے کو تھا۔ مجھے دیکھ کر اس کے چہرے پر تازگی سی چھا گئی۔

”تم یہاں ہو یا بڑا..... میں تو تمہیں دیکھنے کے لیے تھانے جانے والا تھا“ میں گاڑی میں بیٹھ گیا۔ ”نہیں..... رات کو ابا مجھے وہاں سے چھڑا لائے تھے..... اب میں ان کی قید میں ہوں.....“ میری بات سن کر اسماعیل زور سے ہنسا..... ”فکر نہ کرو..... میرے مالک دوہی گئے ہوئے ہیں..... آج کل میں ان کی واپسی ہے..... ان کے آتے ہی تمہارا یہ جھگڑا ہمیشہ کے لیے ختم کروادوں گا.....“ اسماعیل نہ جانے اور کیا کچھ کہتا رہا لیکن میرا دھیان تو کہیں اور ہی تھا۔ ٹیوشن میں بھی ناہید گو گزشتہ روز کے باب کی دہرائی کا کہہ کر میں خود کو اپنے اندر کھوجتا رہا۔ میری حالت کے پیش نظر ناہید نے بھی مجھ سے غیر ضروری سوال و جواب سے گریز کیا۔ واپسی پر روانے بے حد اصرار کے ساتھ دو ہزار میری جیب میں ڈال دیے اور جاتے جاتے مجھ سے یہ کیوں کہا کہ ”اپنا خیال رکھا کر لڑ کے.....“

محبت کی بے خودی بھی عجب بے خودی ہے۔ پہلے پہل اس میں صرف گھائل ہونے والے کو اپنے درد کا پتہ چلتا ہے اور باقی ساری دنیا بے خبر ہوتی ہے اور پھر رفتہ رفتہ وہ مقام بھی آ جاتا ہے جب ساری دنیا کو اس جنوں کا پتہ چل جاتا ہے مگر جو خود اس دور جنوں سے گزر رہا ہوتا ہے صرف اسی کو خبر نہیں ہوتی کہ وہ ایک چلتا پھرتا اشتہار بن چکا ہے اور جہاں سے وہ گزرتا ہے فسانہ بن جاتا ہے۔

میرا فسانہ بننے میں بھی بس کچھ دیر ہی باقی تھی۔ مجھے واپسی پر اسماعیل نے کیف فراق اتارا تو شام ڈھل چکی تھی۔ فراق چچا حسب معمول کاؤنٹر

پر کسی گہرے مراتبے میں ڈوبے ہوئے تھے اور ان کا گراموفون چل رہا تھا۔ ”یہ میرا دیوانہ پن ہے۔۔۔۔۔۔ یا محبت کا سرور۔۔۔۔۔۔ تو نہ بیچا تو ہے یہ۔۔۔۔۔۔ تیری نظروں کا تصور۔۔۔۔۔۔“ مجھے لگا کسی نے میرے اندر کے چور کو پکڑنے کے لیے یہ گانا چن کر لگایا ہے۔ اتنے میں اندر کسی گا ہک سے بحث کرتے مرزا کی مجھ پر نظر پڑی تو وہ تیزی سے میری جانب لپکا۔۔۔۔۔۔ ”کہاں تھے تم دن بھر۔۔۔۔۔۔ سادات محلے سے شیخ صاحب کے ہاں سے تین بار تمہارے لیے پیغام آچکا ہے کہ آیا ان میاں آئیں تو ان سے کہوں کہ وہ دو گھنٹی شیخ صاحب کے ہاں سے ہوتے جائیں۔۔۔۔۔۔“ مرزا کی سرگوشیاں آواز سے لگ رہا تھا کہ اسے ہماری اور شوکی کی لڑائی کی اصل وجہ بھی پتہ چل چکی ہے۔ پھر اس نے خود ہی بات کھولی ”رنبہ آیا تھا دو پہر کو۔۔۔۔۔۔ پھر اس کے جانے کے بعد بالا بھی چکر لگا گیا ہے۔۔۔۔۔۔ سچ کہوں تو مجھے تو تم لوگوں کی خالی میز کاٹنے کو دوزخ ہی تھی۔ میں نے بیروں سے کہہ کر اس کی جگہ ہی بدلوادی ہے۔۔۔۔۔۔ جب تم چاروں اکٹھے آؤ گے۔۔۔۔۔۔ تبھی وہ میز وہاں لگے گی۔“ مرزا بولتے بولتے روہانسا سا ہو گیا۔ ہمارا اور مرزا کا بھی ایک عجیب تعلق تھا۔ اس رشتے کا شاید کوئی نام بھی دنیا کی کسی لغت میں موجود نہیں ہوگا۔ ہم نے جب سے ہوٹل سنبھالا۔۔۔۔۔۔ مرزا کو اسی حلیے اور اسی عمر میں کیسے فراق کی منشی گیری کرتے پایا تھا۔ شاید اس کی اصل عمر ہمارے چچا، تانیا، جتنی ہوگی لیکن بچپن سے وہ ہمارے لیے صرف ”مرزا“ ہی رہا۔ ہم نے کبھی اس کے نام کے ساتھ کوئی سابقہ یا لاحقہ احترام یا تکلفاً بھی لگانے کی کوئی ضرورت ہی محسوس نہیں کی تھی۔ سچ ہے، دل کے رشتے کسی بھی سابقہ یا لاحقے سے کہیں زیادہ بالا ہوتے ہیں۔ مرزا ہم چاروں کی ٹیم کا غیر اعلان شدہ پانچواں رکن تھا وہ کون ہی شرارت تھی جس میں اس نے آج تک ہمارا ساتھ نہ دیا ہو؟ ہمارا کون سا ایسا منصوبہ تھا جس میں وہ براہ راست نہیں تو پس منظر میں شامل نہ رہا ہو؟ اسی لیے آج اس کا دل ہم چاروں کی اس مسلط کردہ جدائی پر کٹ رہا تھا۔ میں مرزا سے کچھ پوچھنے ہی والا تھا کہ مجھے دور سے ریحان آتا دکھائی دیا۔ وہ ضرور میری تلاش میں آیا ہوگا۔ میں نے جلدی سے مرزا سے کہا کہ وہ کسی بھی طرح شیخ صاحب کے گھر پیغام بھجوادے کہ میں موقع ملتے ہی وہاں آؤں گا۔ ریحان نے دور سے ہی مجھے گھر چلنے کا اشارہ کیا۔ مرزا نے مجھے نظروں نظروں میں اشارہ کیا کہ ”کام ہو جائے گا“ میں ریحان کے ساتھ گھر کے صحن میں داخل ہوا تو اباحن میں ہی کرسی ڈالے بیٹھے تھے۔ میں چپ چاپ اوپر چھت پر جانے کے لیے ڈیوڑھی کی بیڑھیوں کی جانب بڑھا تو انہوں نے مجھے آواز دی۔

”ٹھہرو۔۔۔۔۔۔ بات سنئے جاؤ۔۔۔۔۔۔“

میں رک گیا۔ ابانے چند لمحے توقف کیا۔ پھر حتمی لہجے میں بولے

”ریحان نے ان لڑکوں کا پتہ لگا لیا ہے۔۔۔۔۔۔ تم کل اس کے ساتھ جا کر ان لڑکوں سے معافی مانگو گے۔۔۔۔۔۔ یہ میرا حکم ہے۔۔۔۔۔۔“

میرے بیڑھیوں پر چڑھتے قدم رک گئے۔

”میں کسی سے معافی نہیں مانگوں گا۔“ میری بات سن کر امی کے ہاتھ میں پکڑا سلور کا گلاس زمین پر گر گیا۔ ریحان نے نظروں نظروں میں مجھے کچھ ایسا اشارہ کیا جیسے اسے میری ذہنی حالت پر کوئی شک ہو۔ ابا کے ہاتھ کی گرفت ان کی چھتری کے دستے پر شدید ہوئی اور وہ غصے میں ایک جھٹکے سے کھڑے ہو گئے۔





## باب 7

ابا غصے میں کھڑے ہو گئے ”دیکھ لیا رافحہ کی ماں..... اب اپنے باپ کو جواب بھی دینا آ گیا ہے اسے..... بس اس کی کس بات تھی.....“ ای نے جلدی سے صورتحال کو سنبھالنے کی کوشش کی اور اپنی سدا بہار فصاحت اور ہزاروں بار کا کہا اپنا پسندیدہ جملہ دہرایا ”انو..... تیرے ابا تیرے بھلے کے لیے ہی یہ سب کہتے ہیں.....“ ابا نے اپنا حتی فیصلہ سنا دیا..... ”اے ایس پی صاحب نے صرف تین دن کی مہلت دی ہے راضی نامے کے لیے..... یہ بھی ان کی بڑی مہربانی ہے، ورنہ ان پر دوسری پارٹی کی وجہ سے بہت دباؤ ہے..... صرف شاگردی کا حق ادا کر رہے ہیں وہ..... تم کل ریحان کے ساتھ جا کر ان لڑکوں سے معافی مانگو گے کہ جو بھی ہوا وہ انجانے میں ہوا..... ایک بار وہ لوگ اپنی شکایت واپس لے لیں تو باقی بات اے ایس پی بلال سنبھال لیں گے.....“ میرا ضبط جواب دے گیا ”لیکن ابا..... پولیس کیا صرف ایک جانب کی بات سننے کے لیے ہی اپنا دفتر کھولے بیٹھی ہے..... شکایت تو ہم بھی درج کرا سکتے ہیں۔ پھر بات برابر کی ہو جائے گی اور فیصلہ عدالت کرے گی..... آپ میرا یقین کیوں نہیں کرتے کہ میں بے قصور ہوں“ ابا زور سے چلائے ”میں یقین کر بھی لوں تو دوسرا کوئی اور نہیں کرے گا۔ ہمارے خاندان میں آج تک کوئی کورٹ پکھری کے چکر میں نہیں پڑا..... یہ ہمیں زیب نہیں دیتا..... اور پھر تم کیا سمجھتے ہو کہ پکھری بنا ثبوت اور گواہ تمہیں بے گناہ مان لے گی۔ دوسروں نے تمہارے لیے پھندا تیار کر رکھا ہے..... میری بوڑھی بڈیوں پر رحم کھاؤ اور اس عمر میں مجھے مزید رسوا نہ کرو..... ہم ان لوگوں کے سامنے بہت چھوٹے..... بہت کم زور ہیں.....“ ابا مزید کوئی بات سننے بغیر اٹھ کر اندر چلے گئے۔ میرا جی چاہا کہ ان سے چلا چلا کر پوچھوں کہ کیا یہ قانون اور عدالتیں صرف بڑے اور منہ زور لوگوں کی حفاظت کے لیے بنی ہیں؟ اور کیا اگر کوئی ثبوت اور گواہ پیش نہ کر سکے تو اسے بے گناہ کہلانے کا کوئی حق نہیں رہتا؟ لیکن وہ میری کوئی صفائی سننے بنا ہی اپنا ترپ کا آخری پتہ پھینک چکے تھے۔ والدین کا آخری ہتھیار کیا ہوتا ہے۔ رشتوں کا جذباتی دباؤ..... ایڈوکیٹل بلیک میلنگ..... تب مجھ جیسی مجبور اور لاچار اولاد کے پاس اور کون سا راستہ باقی رہ جاتا ہے؟ صرف یہی کہ اپنے اندر کو مار کر اور اپنی شخصیت کو منہ کر کے خود کو والدین کی ہراس خواہش اور حکم کی بھینٹ چڑھا دیا جائے جسے وہ جائز اور ہمارے لیے بہتر سمجھتے ہیں۔ میں نے اپنے ابا کے علاوہ اور کسی کے سامنے آج تک ہاتھ نہیں جوڑے تھے اور آج وہی ابا مجھے ایک غنڈے سے معافی مانگنے کا حکم دے رہے تھے وہ رات مجھ پر بہت بھاری گزری اور صبح میرا سر درد سے پھٹا جا رہا تھا۔ گیارہ بجے کے قریب ریحان چھت پر آ گیا ”میں جانتا ہوں یہ سب تمہارے لیے بے حد مشکل ہے..... لیکن ہم ان لوگوں سے ٹکر نہیں لے سکتے۔ چلو تم تیار ہو کر نیچے آ جاؤ۔ ہمیں ابھی بازار جانا ہے.....“

نیچے محن میں ابا بظاہر اخبار پڑھ رہے تھے لیکن میں جانتا تھا کہ ان کا سارا دھیان اس وقت میری طرف ہے۔ میں چپ چاپ ریحان کے ساتھ گھر سے باہر نکل آیا۔ ریحان نے چوڑی گلی کے اسی دوکاندار کی مدد سے شوکی گردہ کو پیغام بھجوایا تھا جہاں سے یہ سارا جھگڑا شروع ہوا تھا۔ ہم سادات محلے میں پہنچے تو ماحول پر کچھ عجیب قسم کا سناٹا طاری تھا۔ میں دل ہی دل میں دعا کر رہا تھا کہ اس موقع پر کہیں شیخ صاحب یا تنویر نظر نہ آئیں۔

گلی میں مڑتے ہی دور سے مجھے شوکی کی جیپ نظر آگئی۔ آج وہ احتیاطاً اپنے ساتھ چار لڑکوں کو لے کر آیا تھا جن میں دو وہی تھے جو اس روز ہم سے پٹ کر گئے تھے۔ مجھے قریب آتا دیکھ کر شوکی جیپ کے بونٹ سے نیچے اتر آیا۔ اس کی آنکھوں میں غصے اور نفرت کی پلٹیں نکل رہی تھیں۔ مجھے سامنے پا کر اس نے گلی والوں کو دکھانے کے لیے زور سے زمین پر تھوکا اور چلا کر بولا ”دیکھ سینڈو..... آج یہ کون سو رہا ہے۔ آج یہ یہ تو 48 گھنٹے بھی تک نہیں پایا اپنی بہادری پر..... لیکن یہ اکیلا کیوں آیا ہے، باقی تین جو کر کہاں ہیں؟“ ریحان جلدی سے بولا ”باقی تین بھی تم سے معافی مانگنا چاہتے ہیں لیکن ان کے والدین نے خوف کی وجہ سے انہیں گھروں میں نظر بند کر رکھا ہے۔ آیان ان سب کی طرف سے تم سے معافی مانگنے کو تیار ہے.....“ شوکی نے ریحان کی بات سن کر اپنے ساتھیوں سمیت ایک زوردار قہقہہ لگایا ”کیا کہا..... ان کے گھر والوں نے چھپا رکھا ہے..... چوڑے کہیں کے..... کب تک شوکی سے بچیں گے.....؟“ پھر شوکی نے آس پاس کے دوکانداروں اور راہ گیروں کو بھیڑا کٹھی کرنے کی غرض سے آوازیں دے کر بلایا اور کچھ ہی دیر میں ہمارے ارد گرد کافی بڑا مجمع لگ چکا تھا۔ شوکی کو اس روز ہمارے ہاتھوں جو ہزیمت اٹھانا پڑی تھی اس کے تدارک کے لیے یہ سب بہت ضروری تھا کہ لوگ اپنی آنکھوں سے شوکی کے خلاف دخل اندازی کرنے والوں کا انجام دیکھ لیں۔ اب شوکی اور اس کے ساتھی صورتحال کا باقاعدہ لطف لے رہے تھے۔

”ہاں تو کیا کہہ رہے تھے تم..... تمہارا یہ چھوٹا سورا بھائی مجھ سے ہاتھ جوڑ کر اور میرے پاؤں پر ذکر معافی مانگنا چاہتا ہے؟..... کیونکہ اس کی عقل ٹھکانے آگئی ہے اور یہ اس دن کا تمام ہر جانہ بھی بھرنے کو تیار ہے..... بھئی واہ..... لیکن میں یہ سب اس کی زبان سے سننا چاہتا ہوں وہ کیا ہے کہ مجھے یقین نہیں آ رہا کہ کل تک ہمارے سامنے اکڑنے والا تمہارا یہ بہادر بھائی آج کسی خوف زدہ چوہے کی طرح ہمارے تلوے چائے کے لیے تیار ہے.....“

میں چپ کیے کھڑا رہا۔ جب خود میرے اپنے گھر والوں کو میری عزت نفس کا کچھ خیال نہیں تھا تو پھر یہ غڈے اس کا پاس کیوں کرتے۔ ریحان میرے اندر کی حالت سے واقف تھا اور خود اس کی بے چینی بھی بڑھتی جا رہی تھی۔ اس نے مجھے کہنی ماری تاکہ میں اپنی زبان سے معافی کا لفظ ادا کروں۔

”مجھے معاف کر دو..... مجھ سے بڑی بھول ہوئی کہ میں تمہارے راستے میں آیا.....“ میری زبان سے یہ جملہ سن کر شوکی نے نچلے درجے کے اداکاروں جیسی نقل کی اور بولا ”میں نے کچھ سنا نہیں..... کیوں بھائیو..... تم لوگوں نے کچھ سنا..... نہیں نا..... تو بیٹا زار زور سے بولو..... آج صبح امی نے ناشتہ کروا کر نہیں بھیجا کیا.....؟“ شوکی کے مذاق پر اس کے دوستوں نے فرما کٹی قہقہے لگائے۔ بھیڑ میں موجود کچھ بزرگوں کے چہرے پر تاسف کے آثار ابھرے۔ ریحان نے بے چارگی سے میری جانب دیکھا۔ میں نے اس بار باوازی بلند معافی مانگی..... ”مجھے معاف کر دو.....“ شوکی نے خوش ہو کر تالی بجائی..... ”ہاں..... یہ بات..... لیکن کیا تمہیں تمہارے بڑوں نے معافی مانگنے کا طریقہ بھی نہیں سکھایا..... بیٹا..... معافی ہاتھ جوڑ کر مانگی جاتی ہے..... آگے بڑھو اور ہاتھ جوڑ کر مجھ سے معافی مانگو.....“ مجھے میں تیز سرگوشیاں شروع ہو گئیں۔ شاید وہ سب میرے صبر کی انتہا کے منتظر تھے۔ ریحان نے آگے بڑھ کر خود شوکی کے سامنے ہاتھ جوڑنے کی نیت سے قدم اٹھایا، لیکن میں نے ہاتھ پکڑ کر اسے روک لیا اور خود شوکی کے سامنے جا کھڑا ہوا کچھ دیر تک ہم ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے دیکھتے رہے۔ شوکی کی آنکھوں میں بے چینی کی ایک لہری ابھری۔ خوف کا ایک اصول یہ بھی ہے کہ خوف کو خوف کی حد میں رکھ کر دوسرے کو مجبور کیا جائے۔ اگر اس موقع پر میں شوکی کی بات ماننے سے انکار کر دیتا تو چاہے

مجھے بعد میں جو بھی نتائج بھگتنا پڑتے..... لیکن شوکی کا علاقے کے لوگوں پر پھیلایا ہوا خوف کا یہ جال ٹوٹ جاتا..... اور اس وقت وہ اس کا ہرگز متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ پہلے ہی ہمارے ہاتھوں اپنے ڈر اور دہشت کے بت کو پاش پاش ہوتے دیکھ چکا تھا۔ اسے یہ بھی خبر تھی کہ میں یہاں اس کے خوف کی وجہ سے نہیں بلکہ اپنی کسی مجبوری کی وجہ سے کھڑا تھا، لیکن شوکی نے پورے مجھے کو یہی باور کرا رکھا تھا کہ میں اس کے خوف کی وجہ سے یہاں آیا ہوں۔ میں کچھ دیر مزید شوکی کی آنکھوں میں اس بے یقینی اور بے چینی کی لہر سے لطف اندوز ہونا چاہتا تھا لیکن ریحان کی بھرائی ہوئی آواز نے مجھے ایسا نہیں کرنے دیا۔

”آیا ان..... میری خاطر یا ر.....“ میں نے ریحان کی جانب دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو اور لبوں پر الجھتی۔ میرا بھائی مجھے اس وقت دنیا کا سب سے مجبور انسان نظر آیا۔ میں نے ایک قدم بڑھا کر شوکی کے سامنے باقاعدہ ہاتھ جوڑ دیے۔ شوکی کے دوستوں نے تالیاں پیشیں اور سیٹیاں بجائیں۔ بھیڑ میں بہت سے لوگوں نے سر جھکا دیے۔ یہ صرف میری نہیں شاید ان کے اندر کے آدمی کی بھی شکست تھی۔ شوکی چند لمحے مجھے انہی سفاک نظروں سے گھورتا رہا اور پھر چلا کر سب کو سنانے کے لیے بولا ”آج تو معاف کیے دیتا ہوں..... لیکن آئندہ اگر شوکی کے راستے میں آیا تو میرے جوتوں پر اپنا ماتھا بھی رگڑے گا تو نہیں معاف کروں گا.....“ میں پلٹ کر واپس جانے لگا تو شوکی نے ریحان کو آواز دی ”سنئے ہو بڑے بھیا“ اپنے چھوٹے بھائی کی غلطی کا جرم مانہ تو بھرتے جاؤ.....“

شوکی شاید بھیڑ کو یہ پیغام بھی دلوانا چاہتا تھا کہ ان لڑکوں نے اسے اس علاقے میں بہتہ لینے سے روکا تھا آج ان کا لیڈر خود اسے بہتہ دینے پر تیار ہے۔ یہ سارے نفسیاتی حربے شوکی جیسے غنڈوں کو بخوبی پتہ تھے، اور شاید یہ ان کا کاروبار دہشت کے لیے ضروری بھی تھے۔ ریحان نے ٹوٹی ہوئی نظروں سے میری جانب دیکھا اور اپنی جیب سے دو ہزار روپے کے نوٹ نکال کر شوکی کی پھٹلی پر رکھ دیے۔ یہ وہی دو ہزار روپے تھے جو میں نے گزشتہ رات ریحان کو امی کو دینے کے لیے حوالے کیے تھے۔ میری زندگی کی پہلی کمائی جسے دیکھ کر میری ماں کی آنکھوں میں چند لمحے کے لیے ہی سہی..... پر ایک ایسی چمک لہراتی جو میری اس ناکارہ زندگی کا حاصل ہوتی۔ ریحان نے وہی دو ہزار شوکی کو دے دیے۔ شاید اس بات کا حکم بھی ابانے ہی اسے دے رکھا ہوگا۔ شوکی کے لیے ان دو ہزار روپوں کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ ایسے جانے کتنے نوٹ وہ روزانہ آس پاس کی دوکانوں سے لوٹ کر لے جاتا ہوگا مگر میرے لیے وہ دو ہزار کیا تھے، یہ میں ہی جانتا تھا۔ ابا کی پوری پینشن، امی کے لیے مینے بھر کا سودا سلف، چھوٹی کے لیے مہینوں سے کیا ہوا گرم شال کا وعدہ، ریحان کی پسند کی کوئی کتاب..... جانے کون کون سے خواب چھپے تھے ان دو ہزار کے نوٹوں میں..... چاہے ان میں سے کوئی ایک خواب ہی پورا ہوتا پر ہوتا جاتا..... ریحان نے میرا وہ پہلا معصوم خواب شوکی کی پھٹلی پر رکھ دیا تھا۔ شوکی نے چند لمحے حقارت سے ان نوٹوں کو دیکھا ”ہونہہ..... بس..... اتنے کے تو شوکی روزانہ پان کھا جاتا ہے.....“ شوکی نے بے پرواہی سے وہ نوٹ اپنے سر سے وار کر پیچھے کھڑے اپنے ساتھیوں پر نچھاور کر دیے۔ ریحان نے میرا ہاتھ پکڑا اور مجھے بھیڑ کے اندر سے راستہ بناتے ہوئے واپسی کی راہ لی۔ لوگ آپس میں سرگوشیاں کر رہے تھے ”سچ ہے بھی..... ان غنڈوں سے کون نپٹ سکتا ہے“..... ”لڑکے نے اچھا ہی کیا..... ورنہ ساری عمر کا نقصان اٹھاتا.....“۔

”ہم نے تو پہلے ہی کہا تھا کہ سارنگا سے پڑگان کو مہنگا پڑے گا.....“ ریحان سنی ان سنی کرتے ہوئے تیزی سے میرا ہاتھ تھامے آگے بڑھتا



رہا۔۔۔۔۔ میں تو پہلے ہی اپنی ساری سماعتیں کھوپچا تھا۔ میرے لیے اب کوئی لفظ معنی نہیں رکھتا تھا۔ شاید میں وہیں شوکی کے سامنے کھڑے کھڑے ہی مر گیا تھا۔

ریحان مجھے گھر لے جانا چاہتا تھا لیکن کیفے فراق کے سامنے میں نے اس سے اپنا بازو چھڑا لیا۔

”تم لوگ جو چاہتے تھے وہ ہو گیا۔۔۔۔۔ اب مجھے کچھ دیر کے لیے تنہا چھوڑ دو۔۔۔۔۔“ ریحان سٹ پنا سا گیا ”لیکن وہاں گھر میں سب لوگ ہمارا انتظار کرتے ہوں گے۔۔۔۔۔“

”تم تنہا واپس جا کر انہیں یہ شرم ناک داستان سناسکتے ہو۔۔۔۔۔“ میں ریحان کی مزید کوئی بات سننے بغیر وہاں سے پلٹ گیا۔ ریحان جانتا تھا کہ اس وقت میں اس کی کوئی بات نہیں مانوں گا۔ وہ پیچھے سے چلا کر بولا ”اچھا ٹھیک ہے لیکن جلدی گھر واپس لوٹ آنا۔۔۔۔۔ امی تمہاری راہ دیکھ رہی ہوں گی۔۔۔۔۔“

میرا دل اس وقت زور زور سے رونے کو چاہ رہا تھا۔ میں اتنی زور سے چیخنا چاہتا تھا کہ میری آواز سے آسمان پھٹ جائے۔۔۔۔۔ جانے میں کہاں جا رہا تھا؟ شاید کسی ایسے ہم درد کی تلاش میں جس کے سامنے میں اپنی روح پر لگے ان زخموں کی ٹیسوں کو کچھ دیر کے لیے بھلا سکتا، اور پھر مجھے تب ہوش آیا جب میرا ہاتھ شیخ صاحب کے دروازے پر دستک دے چکا تھا۔ کچھ دیر بعد دروازہ کھلا اور تنویر میرے سامنے کھڑا تھا ”ارے۔۔۔۔۔ بڑی لمبی عمر پائی ہے تم نے۔۔۔۔۔ ماموں ابھی تمہارا ذکر ہی کر رہے تھے۔“ تنویر اپنا نیت میں آپ سے تم پر آ گیا تھا۔ وہ میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے اندر بیٹھک کی جانب لے گیا۔ صحن کے برآمدے میں ایک جانب بنے باورچی خانے سے دوپہر کے کھانے کی خوشبو سے سارا آنگن مہک رہا تھا۔ مجھے احساس ہوا کہ میری بے وقت آمد آداب کے خلاف ہے لیکن اب کیا ہو سکتا تھا۔ مجھے وقت کا احساس ہی کب تھا بھلا؟ اور پھر جب کچھ ہی دیر بعد بیٹھک میں خوان آنے لگے تو میرے خدشات حقیقت میں بدل گئے۔ شیخ صاحب اور ان کے گھر والے میری آمد کے وقت دوپہر کے کھانے کے لیے بیٹھ چکے تھے اور میری وجہ سے انہیں اٹھنا پڑا تھا۔ میں تنویر اور شیخ صاحب سے معذرت ہی کرتا رہ گیا کہ مجھے بالکل بھوک نہیں ہے اور میں یوں اچانک آنے پر بہت شرمندہ ہوں مگر میزبان بھلا کب مہمانوں کے عذر سنتے ہیں؟ مجبوراً مجھے شیخ صاحب اور تنویر کا ساتھ دینے کے لیے نہ چاہتے ہوئے بھی چند نوالے لگنا پڑے۔ بے وقت اور بنا بھوک کھانا بھی کیسی سزا ہے؟ اس کا اندازہ مجھے اسی روز ہوا۔ شاید انسان سدا ہی سے بس اپنی منشا کا غلام ہے۔ اسی لیے یہ بڑے بڑے تیاگی اور جوگی اپنی مرضی کو ترک کر دینے میں ہی اپنی زندگی کا حاصل پوشیدہ سمجھتے ہیں۔

کھانے کے بعد درمیانی دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی اور قبوہ تھما دیا گیا۔ جانے مجھے ایسا کیوں لگا کہ دروازے کی دوسری جانب گہنا تھی۔ شیخ صاحب نے باتوں کے دوران میری ذہنی غیر موجودگی کو محسوس کر لیا تھا اور پھر آخر مجھے انہیں آج کا تمام واقعہ تفصیل سے سنانا ہی پڑا۔ مجھے یوں محسوس ہوا کہ اس تمام عرصے میں درمیانی دروازے کے پیچھے ہماری گفتگو کو مستقل سنا جا رہا ہو۔ لہذا بار بار یہ بھول جاتا کہ میں شیخ صاحب سے مخاطب ہوں یا پھر اس میچا سے کہ جس کے سامنے اپنے دل کا درد بیان کرتے ہوئے مجھے راحت محسوس ہو رہی تھی۔

میری بات ختم ہونے پر شیخ صاحب نے لمبی سی سانس لی۔ ”چلو جو ہوا بہتر ہوا میاں۔۔۔۔۔ دراصل میں خود بھی تمہیں یہی کہنے کے لیے کل سے بلا رہا تھا کہ اس فساد کو ختم ہی کر دو تو بہتر ہے۔ تم نے آج بڑی بہادری کا کام کیا۔ بہادری صرف دشمن کو زیر کر لینے کا ہی نام نہیں۔ اصل بہادری وہ ہوتا ہے جو اپنے

غصے اور خواہش پر قابو پالے۔ جو تم نے کر کے دکھا دیا.....“

میں خاموش رہا۔ شیخ صاحب کچھ دیر کے لیے نماز ادا کرنے کے لیے معذرت کر کے اندر چلے گئے۔ پردے کے پیچھے سے تنویر کو برتنوں کی دایہی اور مزید چائے کے لیے پوچھا گیا۔ تنویر نے برتن لوٹا دیے۔ میں نے جانے کے لیے اجازت طلب کی۔ شیخ صاحب بھی لوٹ آئے۔ جانے کیوں اس وقت میرا دل بہت عجیب انداز میں دھڑکا۔ شاید دل کی فریادیں کبھی کبھی براہ راست ساتویں آسمان سے بھی پرے قبولیت کے کسی ستون سے جا کر ٹکراتی ہیں۔ ٹھیک اسی وقت جب میں شیخ صاحب سے رخصت طلب کر کے پلٹنے والا تھا۔ درمیانی پردہ ہٹا اور شیخانی جی بیٹھک میں آگئیں۔ ان کے پس منظر میں ستارہ اور گہنا کی جھلک بھی دکھائی دے گئی وہ دونوں دروازے کے پرے رکی رہیں۔ شیخانی جی نے مجھ سے کہا کہ وہ اور دونوں بچیاں سمجھتی ہیں کہ مجھے کچھ دنوں کے لیے اس شہر سے کہیں باہر چلے جانا چاہئے تاکہ وہ غنڈے مزید کوئی شرارت نہ کر سکیں۔ میرا دل کچھ عجیب سے انداز میں دھڑکا۔ گویا وہ میرے بارے میں سوچتی ہے۔ ابھی اس کی ماں نے یہی تو کہا کہ وہ دونوں بھی ایسا سوچتی ہیں۔ ستارہ اور گہنا..... میری نظر اٹھی اور شیخانی جی کے پس منظر میں فکر مند سی گہنا پر پڑی۔ مجھے لگا جیسے دنیا میں سب کچھ برائیں ہے۔ کوئی ماہ رو ہے جو میرے لیے پریشان ہے۔ شیخانی جی نے مسکرا کر پوچھا ”اب تو تمہارے اہتمام سے ناراض نہیں رہیں گے؟“ اور ان کی بات ختم ہوتے ہی گہنا کی کھلتی آواز نے ماحول متبسم کر دیا ”اور ہاں..... اگر اس بار آپ کے ابا آپ کو گھر بدر کریں تو فٹ پاتھ پر رات گزارنے کے بجائے یہاں آجائے گا۔ یہ بھی آپ ہی کا گھر ہے۔“ شیخ صاحب نے تنبیہ کی ”گہنا..... ایسا نہیں کہتے.....“ میں بھی مسکرایا۔ ”گھر بدر کیا تو آپ کی پیش کش پر ضرور غور کروں گا، لیکن اگر شہر بدر کرنے کے احکامات آگئے تو پھر کیا ہوگا.....“ سب زور سے ہنس پڑے۔ وہ مسکرائی اور میرا زندگی میں کھویا اعتماد بحال ہونے لگا۔ دروازے پر رخصت کرتے وقت تنویر نے مجھے بتایا کہ وہ آج کل شام میں سی ایس ایس کی تیاری کر رہا ہے۔ اگر میں اس کے ساتھ جڑنا چاہوں تو اسے خوشی ہوگی۔ ”نہیں تنویر..... یہ مقابلے کا امتحان وغیرہ میرے بس کی بات نہیں..... مجھے تو اس مستقل غلامی سے دور ہی رکھو..... ویسے تمہیں یہ خیال کیسے آیا.....؟“۔

”بس..... سوچا کہ یہ معرکہ بھی سر کر لیا جائے..... افسر بن کر دیکھا جائے.....“ میں نے مسکرا کر تنویر کے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔ ”افسر بن کر ہمیں نہ بھول جانا جہاں پناہ.....“

دن بھر آوارہ گردی کے بعد میں شام ڈھلے کالونی میں داخل ہوا تو محلے میں مٹی کے گھر کے باہر غیر معمولی چمک پھیل اور چند پولیس والوں کو کھڑا دیکھ کر میرا ماتھا ٹھنکا۔ اچانک بیٹھڑ میں سے راجہ دوڑتے ہوئے آکر مجھ سے لپٹ گیا۔ وہ زار و قطار رو رہا تھا۔

”کہاں تھا تو انو..... یار شوکی اور اس کے غنڈوں نے مٹی کو بہت مارا ہے..... ابھی کچھ دیر پہلے اسے ایسوی لنس میں ہسپتال لے کر گئے ہیں.....“۔



## باب 8

میرے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ رجبہ نے مجھے بتایا کہ شام کو جب مشی فٹ بال گراؤنڈ سے واپس آ رہا تھا تو محلے کے باہر اسے شوکی گروہ نے گھیر لیا اور اسے مجبور کرنے لگے کہ وہ ان سے ہاتھ جوڑ کر معافی مانگے ورنہ وہ اس کی ہڈی پسیلی ایک کر دیں گے۔ مشی کے انکار پر بات بڑھ گئی اور انہوں نے مشی کو بے رحمانہ تشدد کا نشانہ بنا کر وہیں سرک کنارے پھینک ڈالا۔ بالا ایوبو لنس میں مشی کے ابا کے ساتھ ہسپتال جا چکا تھا اور رجبہ میری تلاش میں نکلنے والا تھا۔ رجبہ زار و قطار رو رہا تھا۔ خود میرا دل ایسا ڈوبا کہ میرے لفظ ہی گم ہو گئے تھے۔ ہم ہسپتال پہنچے تو کالونی کے بزرگ مختلف ٹولیاں بنائے یہاں وہاں کھڑے سرگوشیوں میں مشغول تھے۔ انہی میں مجھے ابا بھی ایک ٹولی میں کھڑے دکھائی دیے۔ ریحان نے ہسپتال کی راہداری میں مجھے دیکھا تو تیزی سے میری جانب لپکا۔ ”کہاں تھے تم..... کب سے تمہیں ڈھونڈ رہا ہوں.....“ میں نے ریحان کی سنی ان سنی کرتے ہوئے اس سے پوچھا ”مشی اب کیسا ہے..... کس وارڈ میں رکھا ہے اسے.....؟“ ریحان نے مجھ سے نظریں چرائیں۔ وہ اسے آئی سی یو میں لے گئے ہیں.....“ میرے ذہن میں دھماکے سے ہونے لگے۔ مشی کو انتہائی نگہداشت کے وارڈ میں لے جایا گیا تھا۔ مطلب اس کی حالت خطرے سے باہر نہیں ہے۔ میں ان سب کے ساتھ کر لڑتے قدموں سے آئی سی یو کے باہر والی راہداری میں پہنچا تو وہاں ایک عجیب سی خاموشی طاری تھی۔ صرف بالا مشی کے ابا کے ساتھ راہداری میں دیوار کے ساتھ جزی کر سیوں کی قطار میں خاموش سا بیٹھا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ یوں تیزی سے اٹھ کر میری جانب بڑھا جیسے کوئی ناراض بچہ اپنی ماں کو دیکھ کر اپنے ٹوٹے کھلونے کی شکایت کرنے کے لیے اس کی جانب دوڑتا ہے لیکن وہ میرے قریب آ کر بھی کچھ کہہ نہیں پایا۔ بس میرے کاندھے پر سر رکھ کر رو پڑا۔ اس کے ہاتھ میں مشی کی ٹوٹی ہوئی عینک کا فریم تھا۔ مشی کو بچپن میں ہی نظری عینک لگ گئی تھی اور ہم جب اسے جش مش کہتے تھے تو وہ بہت چڑتا تھا۔ دراصل اس کا یہ بگڑا ہوا نام یعنی مشی بھی اسی چڑ یعنی جش مش کی اگلی اختراع تھا۔ وہ جہانگیر سے چشمش اور پھر مشی کب بنایا تو ہمیں یاد نہیں تھا لیکن اتنا ہم سب جانتے تھے کہ ہم چاروں میں وہ سب سے زیادہ نازک اور نفاست پسند تھا۔ گھر کا اکلوتا بچہ ہونے کی وجہ سے اپنی ماں کا شدید لاڈلا اور باپ کی آنکھوں کا تارا تھا۔ اسے شروع سے ہی ان لڑائی جھگڑوں سے سخت کوفت ہوتی تھی اور ہمارے ہر پھڑے کی شروعات سے ہی اس کی یہ کوشش رہتی تھی کہ معاملہ صلح صفائی سے ہی ٹل جائے تو بہتر ہے، لیکن اگر معاملہ آخر کار اس کے برعکس بھی ہوتا تو اس نے کبھی پیٹھ نہیں دکھائی تھی۔ مشی کی درجنوں عینکیں ان جھگڑوں کے دوران ٹوٹی تھیں لیکن آج بالے کے ہاتھ میں وہ شکستہ شیشوں والا فریم دیکھ کر میرا دل ٹکڑے ٹکڑے ہوا جا رہا تھا۔ کیونکہ آج ہمارا دوست تنہا دشمن کے ہتھے چڑھ گیا تھا۔ اگر ہم میں سے کوئی ایک بھی مشی کے ساتھ ہوتا تو ان کی اتنی ہمت نہ ہوتی کہ وہ تنہا مشی کو لٹکا کرتے۔ ہمیں جدا کرنے والے بھی اس جرم میں برابر کے شریک تھے۔ اچانک راہداری کے آخری سرے سے چچا فراق اور مرزا بوکھلائے ہوئے سے آتے دکھائی دیے۔ مشی کے ابا نے جلدی سے پوچھا ”خون کا انتظام ہو گیا.....؟“

”ہاں..... خون تو ہم بلڈ بینک میں جمع کرا آئے ہیں اور ڈاکٹر کو اطلاع بھی کر دی ہے، لیکن شاید اور ضرورت بھی پڑ جائے۔“ مشی کے ابا نے



ہاتھ آسمان کی جانب اٹھادیے ”یا مالک..... بس تیرا ہی آسرا ہے..... میرے بچے پر دم کر.....“

کتنی عجیب بات تھی کہ ہم تین دوستوں میں سے کسی کا بھی خون مٹی کے خون کے گروپ سے میل نہیں کھاتا تھا جبکہ میں تو یہ سمجھتا تھا کہ اتنا عرصہ ساتھ رہنے کے بعد دوستوں کا خون بھی ایک جیسا ہو جاتا ہوگا کیونکہ یہ وہ رشتہ ہے جو خون کے رشتوں کو بھی پار کر جاتا ہے۔

جانے کب گہری شام رات میں ڈھلی اور کب رات کو صبح کے اجالے نے نگل لیا۔ ہمارے لیے وقت اور گھریاں ٹھہر چکی تھیں۔ ہم وہیں آئی سی یو کی راہداری میں دیواروں سے ٹیک لگائے بیٹھے رہے۔ مٹی کی حالت بگڑے اڑتالیں گھنٹوں سے زیادہ گزر چکے تھے۔ جب بھی وارڈ کا دروازہ کھلتا، ہم سب کے دل دھک سے رہ جاتے۔ مجھ میں تو اتنی ہمت بھی نہیں تھی کہ آگے بڑھ کر کھڑکی کے شیشے سے اسے پیوں میں لپٹا پڑا دیکھ لوں۔ پولیس والے تین چار مرتبہ مٹی کا بیان لینے آچکے تھے لیکن وہ ہوش میں آتا تو کوئی بیان دیتا میں نے مرزا کے ذریعے اسماعیل کو پیغام بھجوایا تھا کہ شاید میں دو چار روز ٹیوشن کے لیے نہ جاسکوں۔ لہذا وہ مجھے لینے نہ آئے۔ ریحان نے دبے لفظوں میں مجھے ایک دوبار گھر چل کر تازہ دم ہو جانے کا کہا لیکن وہ خود بھی جانتا تھا کہ میں اب یہاں سے تب تک نہیں نلوں گا جب تک مٹی کی حالت سنبھل نہیں جاتی۔ اسی اور رافہ محلے کی باقی عورتوں سمیت اب تک دوبار وارڈ کے باہر ہی سے مٹی کو دیکھنے آچکی تھیں۔ البتہ مٹی کی اماں تو اسی وقت سے جائے نماز پر سجدے میں پڑی ہوئی تھیں جب سے انہیں اپنے لاڈلے کی خبر ملی تھی وہ مٹی کو دیکھنے بھی نہیں آئی تھیں۔ راجہ اور بالا بھی دو روز سے اپنے گھروں کو نہیں گئے تھے۔ ہم تینوں کے دل کے اندر اس وقت جو طوفان اٹھ رہا تھا اسے ہم نے صرف مٹی کی اہتر حالت کے پیش نظر اپنے سینے میں دبا رکھا تھا، اور شاید کہیں نہ کہیں اس جوار بھائے کی خبر ہمارے والدین کو بھی تھی۔ تبھی جب تیسری رات محلے کے بزرگ مٹی کے ابا کو تسلی دے کر گھر لوٹنے کے لیے پلٹے تو انہوں نے اشارے سے مجھے اپنے پاس بلایا۔

”غصے میں آکر ایسا کوئی قدم نہ اٹھا لینا کہ جس کے لیے بعد میں تمہیں پچھتاوا ہو۔ اللہ نذیر کے بیٹے کو جلد شفا عطا کرے، یاد رکھو..... قانون ایسے غنڈوں سے پنپنے کے لیے ہی بنا ہے.....“

میرا جی چاہا کہ ان سے پوچھوں کہ اس وقت یہ قانون کہاں تھا جب ہم چاروں حوالات میں بند تھے، لیکن میں چپ رہا۔ یہ وقت ان سے بحث کے لیے مناسب نہیں تھا۔ مجھے آج تک ایک بات کی سمجھ نہیں آئی تھی کہ شرافت انسان کو بزدل بنا دیتی ہے یا بزدل اپنے اوپر شرافت کا لبادہ اوڑھے پھرتے ہیں؟ شرافت کی اصل تعریف کیا ہے؟ اور کیا تھا نے کچھری جیسی جگہیں صرف شریفوں کے نام پر ہی ہمیشہ کے لیے بے لگا دیتی ہیں کیا شرافت اجلا لباس اس قدر نازک ہوتا ہے کہ ان مقامات سے صرف گزری اسے ہمیشہ کے لیے داغ دار کر دیتا ہے؟ کہ انہیں ہمیشہ سے بُرے لوگوں کی گزرگاہ سمجھا گیا ہے۔

تو پھر شرفاء کو انصاف دلانے کے لیے کب اور کون سی جگہ وجود میں آئے گی؟ اگر کسی شریف کا واسطہ کسی غنڈے سے پڑ جائے تو وہ داوری کے لیے کہاں جائے؟ کیونکہ بقول ابا تھا نہ کچھری جانا شرفاء کو زیب نہیں دیتا۔ کاش حکومت نے شرفاء اور غیر شرفاء کے لیے علیحدہ سے انصاف کی فراہمی بھی ممکن بنائی ہوتی کیونکہ جس دو غلے، منافق اور بوسیدہ معاشرے میں ہم نے جنم لیا ہے وہاں تو انصاف سے متعلق ہر مقام کو پہلے ہی ناکامی کا سامنا ہے یا پھر شاید یہ بھی ہم جیسے نام نہاد شرفاء کا حقیقت سے فرار کا ایک خود ساختہ بہانہ ہے۔ دراصل یہ ہم جیسے شرفاء ہی ہوتے ہیں جو اس غنڈہ گردی کے پھلنے پھولنے کا باعث ہوتے ہیں۔ ہمیں صرف گلیوں کے کٹڑ، سنسان چوراہوں اور گھریاں چار دیواری کے پیچھے چھپ کر سرگوشیاں کرنا آتی ہیں۔ ہم برائی کے خلاف اعلان

کرنے کی جرأت ہی نہیں رکھتے، صرف کسی غیبی نجات دہندہ کے انتظار میں جھوم کا حصہ بنے رہتے ہیں۔ کبھی جھوم سے ایک قدم آگے بڑھ کر ظالم کو لٹکانے کی ہمت نہیں کرتے۔ کیونکہ ہمیں تنہا رہ جانے کا خوف ہر دم ستاتا ہے۔ مجھے اس روز اپنے ارد گرد کی اس منافقت سے گھن آنے لگی تھی۔

آخر آسمان کو ہم پر رحم آیا اور تیسرے دن مٹی نے زرا دیر کے لیے آنکھیں کھولیں۔ اتفاق سے اس وقت اس کے نزدیک بالاموجود تھا۔ وہ چنچنا چلاتا شور مچاتا ہوا راہ داری میں نکل آیا۔ مٹی کے باپ کے ہاتھ سے تسبیح گر گئی اور میں گھبرا کر اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ بالے کے منہ سے آواز نہیں نکل رہی تھی۔

”انو..... یار..... وہ..... وہ مٹی کو ہوش آ رہا ہے۔“ ہم سب اندر کی جانب بھاگے، راہداری میں کھڑا تھا نے دار بھی اپنے مٹی کے ساتھ لپکا۔ مٹی کی نظر مجھ پر پڑی تو اس کے نیلے ہونٹوں پر وہی بچپن والی معصوم سی مسکراہٹ ابھری۔ اس کی آواز سرگوشی نہ تھی۔ ”انو..... کہاں تھا یار.....“ میں نے جلدی سے مٹی کا ہاتھ تھام لیا ”میں یہیں ہوں..... اب میں تمہیں چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گا.....“ تھا نے دار نے جلدی سے ہمیں ایک طرف کیا اور مٹی پر سوالوں کی بوچھاڑ کر دی۔ ”تمہاری یہ حالت کس نے بنا کی..... کیا تم ان لوگوں کے نام بتا سکتے ہو..... انہیں پہچان سکتے ہو.....؟“

مجھے تھانیدار کی بات پر شدید غصہ آ گیا۔ ”آپ کو ابھی تک ان کے ناموں کا پتہ نہیں چلا..... یہ وہی لوگ ہیں جن کے کہنے پر آپ نے اس روز ہمیں گرفتار کیا تھا۔ آپ کو ابھی تک ثبوت اور گواہ کی تلاش ہے۔“ تھا نے دار نے کڑی نظروں سے مجھے دیکھا۔

”دیکھو لڑکے..... مجھے بیان لینے دو..... میں یہ ساری حقیقت زخمی کی زبان سے سننا چاہتا ہوں.....“

ٹھیک اسی لمحے مٹی کے باپ نے مٹی کو آنکھوں ہی آنکھوں میں وہ اشارہ کیا جو ہر مجبور اور غریب باپ اپنے تئیں اپنی اولاد کی بہتری کے لیے کر سکتا ہے۔ مٹی نے بے چارگی سے ہماری طرف دیکھا اور آنکھیں موندھ لیں ”نہیں..... میں ان میں سے کسی کو نہیں جانتا..... نہ ہی دوبارہ سامنے آنے پر پہچان سکوں گا کیوں کہ اس وقت شام کا اندھیرا پھیل چکا تھا۔“

راجہ اور بالے نے اپنا سر پیٹ لیا۔ تھا نے دار اپنی کارروائی پوری کرنے کے لیے مٹی سے سوالات کرتا رہا اور آخر کار ڈاکٹر کی مداخلت پر بیان ختم کر کے وہاں سے چلا گیا۔

مٹی کے بے ہوشی کے وقفوں میں ہندرتج کی آتی گئی۔ چوتھے روز اس نے زبردستی ہمیں کپڑے اور شکلیں بدلنے کے لیے گھر بھجوا دیا۔ پانچویں روز میں چند لحوں کے لیے ناہید کو نیوٹن دینے بھی چلا گیا۔ ناہید کی سب سے اچھی بات یہ تھی کہ وہ غیر ضروری سوالات سے اذ حد پر بیزار کرتی تھی۔ مجھے دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔

”آیا ان بھائی..... اچھا ہوا آپ آگئے..... میں اور بوا ابھی آپ کا ہی ذکر کر رہے تھے۔ پتہ ہے بھیا..... بابا ابھی آج رات کی فلائیٹ سے واپس آ رہے ہیں۔ سچ آپ ان سے مل کر بہت خوش ہوں گے.....“ میں ناہید کی دل جوئی کے لیے اس کی ہاں میں ہاں ملاتا رہا۔ ورنہ میرا دھیان کہیں اور ہی تھا۔

نیوٹن سے فارغ ہو کر ہسپتال پہنچا تو شیخ صاحب تویر سمیت کمرے سے نکلے نظر آئے۔ مجھے دیکھتے ہی انہوں نے گلہ کیا۔

”یہ کیا میاں..... اتنی بڑی بات ہو گئی اور تم نے ہمیں خبر تک نہیں کی..... وہ تو اچھا ہوا کہ تویر میاں کی مرزا صاحب سے ملاقات ہو گئی اور

ان سے اس سانحہ کا پتہ چلا۔“ میں نے جواز پیش کیا۔

”دراصل میں آپ کو پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا۔ آپ پہلے ہی گھر کی پریشانیاں میں گھرے ہوئے ہیں۔“

لیکن شیخ صاحب اب تک ناراض سے تھے ”نہیں آیان میاں۔۔۔۔۔ بس آپ نے ہمیں اپنا نہیں سمجھا۔۔۔۔۔ اور کچھ نہیں جانتے ہو یہ بات سن کر شیخانی جی اور بچیاں کس قدر پریشان ہیں۔ تم آجاتے تو انہیں بھی کچھ حوصلہ ہو جاتا۔“

”ضرور حاضر ہوتا لیکن آپ جانتے ہیں کہ مٹی کی حالت بہت سیریس تھی۔ ابھی دو رات پہلے ہی تو اس نے آنکھیں کھولی ہیں۔“ شیخ صاحب کے چہرے پر دکھ کے تاثرات ابھرے۔ ”ہاں میاں۔۔۔۔۔ بڑا ظلم کیا یا ان ظالموں نے۔۔۔۔۔ خدا انہیں پوچھے گا۔“ میرا جی چاہا کہ میں ان سے کہوں کہ ”اگر ہر ظالم کو اس دنیا میں خدا نے خود پوچھنا ہوتا تو آج یہ دنیا جنت ہوتی“ لیکن میں چپ رہا۔ شیخ صاحب کچھ دیر بیٹھنے کے بعد مجھ سے جلد گھر آنے کا وعدہ لے کر اٹھ گئے۔

رہا اور بالے کو میں نے کسی کام سے باہر بھیج رکھا تھا لہذا ہر آہٹ پر میں چونک چونک جاتا تھا۔ آخر ساڑھے دس بجے کے قریب وہ پہنچ گئے۔ میں نے انہیں ہونٹوں پر انگلی رکھ کر خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور ہم تینوں مٹی کو غنودگی میں چھوڑ کر باہر راہداری میں آگئے۔ راج کی آواز دھمی لیکن پر جوش تھی۔ ”کام کی ابتداء ہو گئی ہے۔۔۔۔۔ ریگل سینما کی پچھلی گلیوں میں آج رات ہفتہ ماگنے والوں سے پنپنے کے لیے یہ چھ لڑکے تیار کر دیے ہیں اور وہ قدر ہے نا۔ ہائی اسکول والا ہمارا کلاس فیلو وہ آج کل شام کے کسی اخبار کار پورٹر لگا ہوا ہے وہ کوئی بھی دے گا اس واقعے کی۔ بس دعا کرو کہ کوئی چوک نہ ہو جائے۔“

”کوئی بات نہیں۔۔۔۔۔ اگر آج وہ ہم سے چوک بھی گئے تو کل پھر آئیں گے۔ اب یہ جنگ ہم میں سے کسی ایک کے خاتمے پر ہی ختم ہوگی۔“ ہم نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اب اس بھتہ خوری کے خلاف خود ہمیں ہی کوئی قدم اٹھانا ہوگا، اور اس کام کے لیے ہم نے آس پاس کی گلیوں میں موجود اپنے جیسے درجنوں فارغ الاوقات نوجوانوں کو متحرک کرنے کا فیصلہ کیا تھا جنہیں راتوں کو گلیوں کی ٹکڑ اور سڑک کے تھروں پر بیٹھنے اور گپ شپ کے علاوہ دوسرا کوئی کام نہیں تھا۔ ہم چاروں کی پیدائش اسی علاقے کی تھی اور ہم میں سے ہر ایک کے بہتوں سے جان پہچان تھی۔ ہمارے اسکول کے لڑکے کالج اور اب یونیورسٹی کے ہم جماعتوں کی ایک کثیر تعداد انہی گلیوں میں بستی تھی۔ ان سب کے والدین بھی انہیں دن بھرنا کارہ اور نالائق ہونے کے طعنے دیتے تھے اور ملک کے لاکھوں کروڑوں نوجوانوں کی طرح ان کا مسئلہ بھی صرف ایک ہی تھا ”روزگار“ لیکن میں جانتا تھا کہ ابھی ان میں سے ایسے بہت سے ہوں گے جن کے دلوں پر منافقت کی مہر نہیں لگی ہوگی۔ ان کے اندر بہتے خون میں انا اور ظلم کے خلاف آواز اٹھانے کے جراثیم بھوک، بے کاری اور بے روزگاری کے طعنوں نے ختم نہیں کیے ہوں گے۔ البتہ شوکی اور اس کے گروہ کو ہم نے اپنے لیے رکھ چھوڑا تھا اور ہم رات دیر تک اس پیامبر کا انتظار کرتے رہے جسے ہم نے شوکی کی خبر دینے پر لگا رکھا تھا۔ آخر صبح کی اذان سے کچھ دیر پہلے مرزا ہانپتے کانپتے ہسپتال پہنچ گیا۔ ”وہ لوگ پٹھان کے ہوٹل پر چائے پرائیڈ کے ناشتے کے لیے رکے ہیں پٹھان انہیں ناشتہ دینے میں کچھ دیر لگائے گا۔ میں اشارہ کر آیا ہوں۔“ ہم تینوں اچھل کر کھڑے ہو گئے۔ مرزا کچھ ہچکایا ”ایک بار پھر سوچ لو۔ بات بہت بڑھ جائے گی۔“ ”بات تو پہلے ہی بہت بڑھ چکی ہے۔ تم بس یہ دھیان رکھنا کہ ریگل چوک سمیت کم از کم دو چار محلوں میں ان گروہوں کو آج رات ٹھیک ٹکڑی ملنی چاہئے۔ شوکی گروہ پر حملے کی خبر تیزی سے گلیوں میں پھیل چلی۔“ مرزا تیزی سے راہداری میں ہمارے پیچھے لپکا ”اس کی تم فکر نہ کرو۔۔۔۔۔ مگر ٹھہرو۔۔۔۔۔ میں بھی تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔“ مرزا تیزی سے ہمارے سامنے آگیا۔



بالے نے اسے گلے لگا لیا "نہیں مرزا جی..... تمہیں اور بہت سے کام کرنے ہیں....." وہ پیچھے سے ڈوبتی ہوئی آواز میں چلایا "اپنا خیال رکھنا نا لا تقو....." ہم جب پٹھان کے ہوٹل کے قریب پہنچے تو ہمیں دور سے ہی شوکی اور اس کے دوستا قیوں کے تعقیب سنائی دیے۔ شاید یہ ان کا روز کا معمول تھا کہ دیر رات تک ہفتہ اکٹھا کرنے یا آوارہ گردی کرنے کے بعد یہاں مفت کا ناشتہ کرنے آتے تھے۔ ہم ان کی بے خبری میں کچھ یوں اچانک ان کے سر پر پہنچے کہ انہیں سننے کا ذرا بھی موقع نہیں ملا۔ پھر راجہ کی ہاکی اور بالے کی بائیک کی چین ان پر کچھ اس طرح برسی کہ مٹی کے جسم پر گلے ہر زخم اور ہرنیل کا حساب برابر ہوتا چلا گیا۔ کچھ ہی دیر میں اس کا رخیر میں پٹھان کے ہوٹل کے وہ ننھے منے بیرے اور چھوٹو بھی شامل ہو گئے جو نہ جانے کب سے روزانہ اس وقت شوکی کی گالیوں اور عتاب کا نشانہ بنتے تھے۔ پٹھان پہلے تو انہیں روکنے کے لیے چیخ رہا تھا پھر کچھ دیر بعد وہ بھی اپنے شاگردوں کو شاباشی دینے لگا "مارواں خانہ خرابوں کو..... اس کا ہڈی توڑ دو....." شوکی اور اس کے ساتھی ہتھیاروں سے لیس تھے لیکن شاید انہیں یہ ہتھیار استعمال کرنے کا کبھی موقع نہیں ملا تھا۔ ہتھیار بہت دن تک استعمال نہ ہوں تو اسے زنگ لگ جاتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح جیسے حرام کی روٹیاں توڑنے والوں کا اندر زنگ آلود ہو جاتا ہے۔ ہمارے سامنے بھی چند زنگ آلود جسم ٹیڑے میڑھے زمین پر پڑے ہوئے تھے۔ میں نے شوکی کو کھینچ کر ایک جھٹکے سے کھڑا کر دیا "معافی مانگتے کے آداب یاد ہیں تمہیں؟" شوکی نے بنا کچھ کراہتے ہوئے میرے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔ میں نے اس کا گریبان چھوڑ دیا اور وہ کسی کٹے ہوئے شہتر کی طرح زمین پر ڈھے گیا۔

اس کے بعد وہی ہوا جو ہم نے سوچ رکھا تھا۔ ہم گھروں کو جانے کے بجائے کیفے فراق کے باہر آ کر بیٹھ گئے۔ ساڑھے آٹھ بجے پولیس کی جیپیں ہمارے استقبال کو پہنچ گئیں۔ اس سے پہلے ہم مرزا کو اپنے لیے وکیل کرنے کا تمام طریقہ کار سمجھا چکے تھے۔ مرزا نے ہمیں بتایا کہ اس رات ریگل سینما سمیت چار مقامات پر بھتہ خوروں سے علاقے کے لڑکوں کی جھپڑیں ہو چکی تھیں۔ صبح کے اخبارات میں چھوٹی مگر نمایاں خبروں میں بھتہ لینے والوں کے خلاف اس ایکے کا ذکر تھا۔ ہمیں بنا کسی تفتیش کے حوالات میں منتقل کر دیا گیا۔

کچھ ہی دیر میں بالے اور راجہ کے ابا بکتے جھکتے اپنے بیٹوں کو کوستے ہوئے تھانے پہنچ گئے لیکن اس بار پولیس نے انہیں باہری رو کے رکھا۔ میرے گھر سے اب تک کوئی نہیں آیا تھا۔ پتہ نہیں مجھے ایسا کیوں لگ رہا تھا کہ اس بار ابا مجھے لینے نہیں آئیں گے۔ پولیس نے اس بار ہم پر دفعات بھی بہت سخت لگائی تھیں اور پھر عصر کے وقت تک میرے خدشات نے حقیقت کا روپ دھار لیا۔ مجھے ڈوبتے سورج کے سمریخان کی روئی صورت دکھائی دی۔ اسے چند لمحوں کے لیے مجھ سے بات کرنے کی اجازت مل گئی تھی۔ اس نے آتے ہی میرا ہاتھ پکڑ لیا۔

"انور یار..... یہ کیا کر دیا....." میں نے اس کی طرف دیکھا

"ابا نہیں آئے....." ریحان نے مجھ سے نظریں چرائیں۔

"میں انہی کا پیغام پہنچانے آیا ہوں۔ انہوں نے کہلا بھیجا ہے کہ وہ اب تم سے کوئی رشتہ باقی نہیں رکھنا چاہتے۔ نہ ہی تم جیل سے رہا ہونے کے بعد گھر کا رخ کرنا۔ انہوں نے تمہارے ساتھ ہر تعلق ختم کرنے کا اعلان کر دیا ہے۔"



## باب 9

میرے ہونٹوں پر ایک زخمی سی مسکراہٹ ابھری ”اس کا مطلب یہ ہوا کہ مغل اعظم نے شہزادے سلیم کو عاق کر دیا آخر کار.....“ میں ریحان اور چھوٹی جب کبھی اچھے موڈ میں امی کو تنگ کرنے بیٹھا کرتے تھے تو ہم اندازہ لگایا کرتے تھے کہ اگر کبھی ابا نے غصے میں مجھے عاق کر دیا تو میں ان کے کس کس ترکے سے محروم ہو جاؤں گا۔ میں انگلیوں پر گنتا ”ایک ٹوٹی ہوئی سائیکل، دو پرانے پارکرین، ایک زنگ زدہ چھتری.....“ اور پھر امی ہمارے مارنے کو لپکتیں تو ہم ہنستے ہوئے بھاگ جایا کرتے تھے، لیکن آج ابا نے آخر کار مجھ سے اپنا رشتہ توڑنے کا اعلان کر ہی دیا تھا۔ ریحان نے جلدی سے مجھے تسلی دی۔

”ایسی بات نہیں ہے آیاں..... وہ تم سے اب بھی بہت پیار کرتے ہیں..... بس ذرا غصے میں ہیں اس لیے ایسا کہہ رہے ہیں۔ تم نے بھی تو ان کی آج تک ایک نہیں مانی.....“

”میری بات ہوتی تو میں نے آج تک انہی کی بات کے سامنے سر جھکایا ہے..... لیکن تم جانتے ہو اس بار معاملہ کچھ اور تھا۔ آج اگر ممشئی کی جگہ ان کا اپنا بیٹا اس ہسپتال کے بستر پر یوں پڑا ہوتا تو کیا تب بھی وہ مجھے یا تمہیں یوں لا تعلق رہنے کا حکم دیتے.....؟..... ہمارے والدین کے سبھی اصول سبھی ضابطے صرف اپنی اولاد کے لیے ہی کیوں ہوتے ہیں.....؟“

ریحان چپ رہا۔ وہ ہمیشہ سے ایسا ہی تھا۔ دوسروں کی مان لینے والا۔ خود ہار جانے والا۔ اسی لیے تو وہ ہمیشہ سب کے دل جیت لیتا تھا، اور میں ہمیشہ سب کچھ جیت کر بھی ہار جاتا تھا۔ آج شاید میں نے ایک اور رشتہ کھو دیا تھا۔

ریحان میرے پاس مزید ٹھہرنا چاہتا تھا لیکن سنتری نے اسے واپس بلا لیا۔ میں واپس حوالات میں آیا تو راجہ اور بالا میرے کہے بنا ہی سب کچھ سمجھ چکے تھے۔ بالے نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھا ”فکر نہ کریا..... یہ سارے ابا ایک جیسے ہی ہوتے ہیں۔ ناریل کی طرح اوپر سے کڑک اور اندر سے ملائی کی طرح نرم۔ تیرے ابا بھی تجھے معاف کر دیں گے آخر کار.....“

باہر اندھیرا چھا چکا تھا۔ ایک سپاہی نے آکر حوالات کے سامنے لگی ہوئی گیس پتی کی لواؤنچی کی ”تم لوگوں میں سے آیاں کون ہے.....؟“ میں کھڑا ہو گیا۔ ”چلو تمہاری ضمانت ہو گئی ہے.....“ میں نے حیرت سے راجہ اور بالے کی جانب دیکھا ”میری ضمانت؟..... کس نے دی.....؟“ سنتری نے معنی خیز نظروں سے میری جانب دیکھا ”بڑے کرموں والے ہو بھی..... ورنہ میں نے تو آج تک سارنگا کے نائب کو خود کبھی کسی کی ضمانت کے لیے تھانے آتے دیکھا..... نہ سنا..... ہم تینوں اچھل ہی تو پڑے“ کیا کہا، سارنگا کا نائب میری ضمانت کے لیے آیا ہے.....؟“ بالے نے میرا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا ”انویار..... مجھے تو یہ کوئی سازش لگتی ہے۔ ضرور وہ تجھے تھانے سے نکال کر کوئی نقصان پہنچانا چاہتا ہے.....“

سپاہی زور سے ہنسا ”اے نقصان پہنچانا ہو تو یہ حوالات اس کی پہنچ سے کیا دور ہے.....“ پھر اچانک اسے احساس ہوا کہ انجانے میں شاید وہ

کوئی ”غیر سرکاری راز“ افشا کر بیٹھا ہے۔ اس نے جلدی سے بات بدلی ”چلو جلدی کرو..... ایس ایچ اوصاحب کے کمرے میں تمہارا انتظار ہو رہا ہے۔“ میں نے باہر نکلنے وقت راجہ اور بالے کو اطمینان رکھنے کا اشارہ کیا۔ تھانے دار کے کمرے کے دروازے پر ایک جھوٹی ہوئی پرانی چمک پڑی ہوئی تھی۔ جہاں سے ایک خاص بیڑی کے دھوس کی مہک نے باہر نکل کر اس تمام اندھیری راہداری کو مہکار کھا تھا۔

میں چمک اٹھا کر کمرے میں داخل ہوا تو تھانے دار مودب سا بیٹھا ہوا سامنے والے کو کچھ وضاحت کر رہا تھا۔ کمرے میں دو اور اشخاص اپنے مضبوط بازوؤں کے کف کہنی تک چڑھائے مستعد سے کھڑے تھے۔ شاید وہ بیٹھے ہوئے شخص کے محافظ تھے۔ تھانیدار کہہ رہا تھا ”لیکن موسیٰ بھائی ان تینوں نے شوکی اور اس کے ساتھیوں کی ہڈی پیلٹی ایک کر کے رکھ دی ہے۔ وہ تینوں اس وقت ہڈیوں کے وارڈ میں داخل ہیں..... لویہ آگیا تمہارا مجرم..... اسی کا نام آیان ہے..... یہی ان سب کا سرغنہ ہے.....“

کمری پر بیٹھا ہوا شخص کھڑا ہو گیا اور میری جانب پلٹا۔ وہ چالیس پینتالیس سال کا ایک دراز قد آدمی تھا۔ چہرے پر نوکیلی مونچھیں، گلے میں کسا ہوا تعویذ اور دائیں ہاتھ پر مضبوطی سے بندھا ہوا امام ضامن..... بازوؤں کی مچھلیاں کرتے کی آستین سے پھٹ کر باہر نکلنے کو تیار، ایک ہاتھ میں لوہے کا سخت کڑا، آنکھوں میں سمندر جیسی گہرائی اور کڑنگی، چہرہ ہر احساس سے عاری اور گھنے بال لٹوں کی صورت میں گدی سے ہو کر شانوں پر جھول رہے تھے۔ وہ موسیٰ تھا۔ کچھ دیر تک ہم دونوں ایک دوسرے کی جانب دیکھتے رہے۔ موسیٰ کی آنکھوں میں ضرور کچھ بات تھی۔ کچھ عجیب سی لہر..... جیسے ایکس رے..... وہ بغور میرا جائزہ لیتا رہا اور پھر مسکرا کر بولا ”اچھا..... تو یہ ہے وہ بہادر جس نے ایک ہی رات میں سارنگا کی چار لٹیوں سے نکر لی ہے..... خوب..... بہت اچھا کیا..... اس حرام خور شوکی کی تو بچی ہوئی پسلیاں بھی تو ڈالنی چاہئے تھیں تجھے..... جی خوش کر دیا.....“

موسیٰ تھانے دار کی طرف مڑا..... ”کو تو ال جی..... شوکی کی طرف سے کیس میں واپس لیتا ہوں۔ تم اس جوان کو ضمانت پر رہا کر دو..... کوئی کاغذ بھرنا ہے تو ابھی بھر دو.....“

ایس ایچ او نے مستعدی سے کہا..... ”لکھت پڑھت بھی ہو جائے گی۔ جب آپ نے کیس ہی واپس لے لیا ہے تو پھر بات ختم ہو گئی۔ جاؤ بھی..... تم اپنے گھر جاسکتے ہو.....“

”میں اپنے دوستوں کو لیے بغیر واپس نہیں جاؤں گا..... اگر رہا کرنا ہے تو ہم تینوں کو رہا کرو..... ان پر بھی وہی الزام ہے جو مجھ پر تھا.....“ تھانے دار نے موسیٰ کی طرف دیکھا۔ موسیٰ نے سر ہلایا۔

”لگتا ہے دوستی کے سبھی سبق پڑھ چکے ہو..... کو تو ال جی..... اس کے دوستوں کو بھی جانے دو.....“ تھانے دار کے اشارے پر باہر کھڑا ایک سپاہی حوالات کی جانب چلا گیا میں نے موسیٰ سے پوچھا ”میں اس مہربانی کی وجہ پوچھ سکتا ہوں؟“ موسیٰ نے تازہ بیڑی زبان سے بھگو کر ہونٹوں میں دبائی۔ اس کے قریب کھڑے ایک محافظ نے جلدی سے بیڑی کو تیلی دکھائی۔ موسیٰ نے ایک گہرا کس لیا

”کیا کریں شہزادے..... تیری سفارش ہی بڑی اونچی آئی تھی..... جیسی تو مالک نے مجھے یہاں بھیجا ہے..... جا اب گھر جا..... تیرے گھر والے تیری راہ دیکھتے ہوں گے.....“